رنگ تنقید

ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی

ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی

RANG-E- TANQEED -BY, DR. ASMAT MALIHABADI

RS. 75/=

ناشر : ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی

طابع : کاکوری آفسیٹ۔ کاکوری کوٹھی، لکھنؤ

چھاپ : بار اول۔ نومبر ۲۰۰۱ء

تعداد : چار سو (۴۰۰)

کتابت : مر لکھنؤ کمپیوٹر، ۱۳۱ر گھسیاری منڈی لکھنؤ۔

فون نمبر 213955

قیمت : پچھتر روپے (75/=)

ملنے کا پتہ

ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی۔ ملیح آباد، لکھنؤ

مکتبہ دین و ادب، امین الدولہ پارک، امین آباد، لکھنؤ

دانش محل، امین الدولہ پارک، امین آباد، لکھنؤ

صدیق بک ڈپو، امین آباد، لکھنؤ

یہ کتاب
فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت
اتر پردیش لکھنؤ کے مالی تعاون
سے شایع ہوئی۔

مندرجات

کتاب سے پہلے	۵
اردو تنقید کا روایتی جائزہ	۹
تنقید میں تحریک اور پسند کا مسئلہ	۱۷
زبان اور تنقید	۲۴
ادب اور انسانی زندگی	۵۸
شاعری میں مرثیے کی اہمیت	۷۳
کیا اردو ادب روبہ زوال ہے	۱۰۱
اردو میں دلت ادب	۱۱۱
جوشؔ شاعر روماں	۱۲۱
والی اور پارکھی	۱۲۹
عشرت کرتپوری اور میری نظر	۱۴۰
ترقی پسند تحریک مرحوم	۱۴۵
لکھنؤ کا نمائندہ شاعر	۱۵۳
خیام - حکمت و فلسفہ کا خیمہ دوز	۱۵۹

"کتاب سے پہلے"

"رنگِ تنقید" روایتی تنقید نہیں ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ میں نے جب جب اپنے استادوں کی تنقیدی کتابوں کا مطالعہ کیا، مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ یا سائنسی تصنیف پڑھ رہا ہوں۔ مطالعے کے بعد ذہن کبھی تازہ نہیں ہوا، بہت سی باتیں واضح بھی نہیں ہوئیں اور یہ بھی نہیں لگا کہ ہم اپنی محفل یا ماحول میں سانس لے رہے ہیں، اسی لیے تکان اور گھٹن ہوتی رہی۔

ناقد کی یہ مجبوری ہے کہ وہ اردو ادیبوں اور شاعروں پر جب تنقید یا تبصرہ کرتا ہے تو اسے مغربی ناقدین و دانش وروں کے افکار و خیالات کے حوالے پیش کرنا ہوتے ہیں، یہ کوئی بری بات نہیں ہے، اگر حوالے اردو مزاج سے ہم آہنگ ہوں تو مزہ بھی دیں گے اور ترسیل میں بھی معاون ثابت ہوں گے لیکن اگر گنجلک اور غیر واضح ہوں گے تو بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ ہمارے زیادہ تر تنقید نگاروں کے ذہن پر انگریزی اور مغربیت سوار ہے۔ عجیب عجیب ناموں اور حوالوں سے

مضامین شروع کرتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اپنی علمیت سے قاری کو خوف زدہ کر دیا جائے اور اپنے قلم کے جادو سے مرعوب کر کے ہم نوا بنا لیا جائے۔ جبکہ علم اب بہت آگے بڑھ چکا ہے اردو قاری انگریزی زبان وادب سے واقف ہے، وہ فرانس کی تحریکوں سے آگاہ ہے، اس نے مارکس اور روسی ادیبوں کو بھی پڑھ لیا ہے، وہ چینی مفکرین کے افکار کو بھی سینے سے لگائے ہے۔ وہ عربی زبان وادب کی عظمت سے آشنا ہے اس نے فارسی شعراء کے نام سن رکھے ہیں اور ہندی و سنسکرت کے ماحول میں آنکھ کھولی ہے۔ اس لیے اب اس پر کوئی جادو چلنے والا نہیں۔ تو پھر کیوں نہ اپنے گھر لوٹ آیا جائے اور اپنی بات کی جائے اور یہ بھی کوشش کی جائے کہ ہم اپنے تنقیدی گھروں میں اپنے ہی وطن کے اینٹ، گارے اور چونے کو استعمال کریں۔

اردو ہندوستان کی زبان ہے۔ عربی، فارسی، پشتو، ترکی، سندھی، کھڑی بولی اور پراکرت زبانیں، اس کی کھلائیاں اور دودھ پلانے والی مائیں ہیں اور یہ تمام زبانیں اپنا ایک مزاج اور وقار رکھتی ہیں۔ ان کی ایک شاندار تاریخ ہے۔ سیکڑوں برس سے ان کی عظمتوں کے چراغ روشن ہیں۔ تو کیوں نہ ہم اردو ادب کو اسی روشنی میں پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کریں۔

کچھ لوگ میری اِس رائے سے اختلاف کریں گے اور کہیں گے کہ ان زبانوں کے پاس علم وادب تو ہے مگر تنقیدی شعور کی کمی ہے۔ اسی لیے میں نے عربی اور پشتو زبان کے تنقیدی ادب پر خصوصی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے تاکہ آپ سمجھ سکیں کہ ہماری اپنی زبانوں میں اچھے اور برے کی تمیز کے لیے کتنے خوبصورت پیمانے موجود ہیں، اس کتاب میں میں نے انشاء پردازی نہیں کی ہے عام فہم اور سادہ زبان میں قارئین سے باتیں کی ہیں۔ میں انشاء پردازی کے

ضابطوں کا بھی شکار نہیں ہوں، یہ باتیں مبتدیوں کو زیب دیتی ہیں۔ میرا اپنا ایک اسلوب ہے، جو آپ کو جگہ جگہ نظر آیئگا۔ اسلوب، زبان، خیال اور شخصیت سے بنتا ہے۔ اگر تحریر میں دلکشی اور حسن ہے تو وہ اچھی ہے اگر سپاٹ اور روکھی ہے تو بری۔ اِس دلکشی کے لیے بھی کوئی ضابطہ اور قاعدہ نہیں ہے۔ یہ تو خود بہ خود مصنف کے قلم سے پھوٹ نکلتی ہے۔ بادلوں اور جھرنوں کی طرح رواں دواں نظر آتی ہے۔ جس مصنف میں گہرائی اور دل کشی نہ ہوگی وہ لاکھ سادہ اور آسان اسلوب میں لکھنے کی کوشش کرے، پھیکا ہی رہے گا۔

چینی ادیب بوفون کہتا ہے --"اسلوب ہی شخصیت ہے" چنانچہ اسلوب لکھنے کا کوئی خاص طریقہ نہیں۔ اسلوب تحریر کی کسی خاص پہنچ کا نام نہیں، نہ تحریر کی زیب وزینت کا نام ہے۔ اسلوب وہ مجموعی تاثر ہے جو قاری کو ایک ادیب کے ذہن کے بارے میں حاصل ہوتا ہے۔ اس میں ادیب کی فکری گہرائی یا اس کا اوچھاپن۔ اس کی بصیرت یا اس کی کور نگاہی، اس کی باقی خصوصیات مثلاً ظرافت طبع، خوش مزاجی تیز اور تیکھی طنز، اس کی سوجھ بوجھ، نزاکت احساس، اور نزاکت ادراک شفقت سے بھرپور کلبیّت یا کلبیّت سے بھرپور شفقت، سمجھ اور شعور اور دنیا کے معاملوں کے متعلق اس کا عام رویہ غیرہ سب شامل ہیں"

رنگِ تنقید کی زبان و مواد عام اردو قارئین کے لئے ہے۔ آسمانی ادیبوں اور تنقید نگاروں کے لئے بازار میں چاند ستاروں کی کمی نہیں ہے۔ میں زمین کا آدمی ہوں میری زمین کتنی دلکش اور حسین ہے۔ اس کے رخسار کتنے گلابی ہیں، اس کی زلفیں کتنی دراز ہیں۔ اس کا حسن کتنا سادہ ہے اور اس کی آنکھیں کتنی کشادہ ہیں۔ اس کا ادراک آپ کو کتاب کے مطالعے کے بعد ہوگا۔

پہلا مضمون پھیکا اور روایتی ہے، یہ محض زیب داستاں کے لئے ہے

لیکن جیسے جیسے آپ آگے بڑھتے جائیں گے آپ پر علم کے دریچے کھلتے چلے جائیں گے اور میرا دعویٰ ہے کہ آپ کچھ دیر کے لیے کتاب میں گم ہو جائیں گے۔ اور پھر میرے چند تنقیدی مضامین سے ملاقات کریں گے۔ ممکن ہے ان میں تنقید کا ایک انوکھا اور دلکش رنگ بھی نظر آجائے۔

کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے میرے دعوے دلیل اور خود اعتمادی کو جانچنے، پرکھنے کے بعد فیصلہ صادر فرمائیں۔ اگر آپ کو یہ کتاب تھکا دے یا بوجھل کردے یا بور کردے تو میری کاوش ناکام ہے۔ لیکن اگر کتاب علم و معلومات کا خزانہ ثابت ہو اور میری باتیں آپ کی سمجھ میں آجائیں تو ایک پوسٹ کارڈ سے ضرور نوازیں۔

ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی
ملیح آباد، لکھنؤ۔

”اردو تنقید کا روایتی جائزہ“

اردو ناقدین پر مغربی تنقید کے اثرات ہیں۔ مغربی تنقید نے جہاں دنیا کی بہت سی زبانوں کو متاثر کیا۔ وہیں اردو نے بھی مغربی ناقدین کے افکار و خیالات کو قبول کیا۔ اردو تنقید میں اگرچہ مغربی ادب جیسی گہرائی و گیرائی و فکر نہیں پائی جاتی لیکن اردو ناقدین نے اپنی تنقیدوں کے ذریعہ سے ادیبوں اور شاعروں کے افکار و خیالات میں ایک اصلاحی پہلو کی نشان دہی ضرور کی۔ ادب برائے ادب ہو یا ادب برائے زندگی ناقدین نے ایک صحت مند ادب کے لئے شاہراہیں تراشیں اور ادیبوں کو ان کی پیروی پر مجبور کیا۔

کسی نثرپارے، شاعری، افسانہ، ڈرامہ یا اصناف ادب میں انصاف اور ایمانداری کے ساتھ اچھائیاں اور برائیاں تلاش کرنا ہی تنقید ہے۔

”ہڈسن کا خیال ہے کہ -ادبی نقاد اسے کہتے ہیں جس
میں کسی فن پارے کو سمجھنے اور اس پر غور کرنے کی خاص صلاحیت
ہوتی ہے۔ اس فن کے ماہر کا یہ کام ہوتا ہے کہ کسی فن تخلیق کو

دیکھے، سمجھے، غور کرے اور اس کی اچھائیوں اور برائیوں کی جانچ کرنے کے بعد اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ لگائے"۔

جہاں تک اردو میں تنقید کے ابتدائی نقوش کا تعلق ہے تو اردو نے ہمیشہ فارسی زبان و ادب کا تتبع کیا۔ فارسی میں تنقید کا کوئی باقاعدہ وجود نہیں ہے۔ عربی ادب میں جاری و ساری چند اصطلاحات و کلمات فارسی تنقید کا سرمایہ ہیں۔ اردو کو فارسی سے وراثت کے طور پر تنقید کے چند بندھے ٹکے اصول ہی ملے تھے، ابتدائی اردو نے انھیں برتا اور ان کے سہارے اپنی نئی منزلوں کی تلاش بھی جاری رکھی۔

اردو میں تنقید کے ابتدائی نقوش تذکروں، نشستوں، خطوں اور اساتذہ کی اصلاحوں میں نظر آتے ہیں۔ نشر و اشاعت کے وسائل محدود ہونے کی وجہ سے شعراء ایک دوسرے کو اپنا کلام ضرور سناتے تھے اور کبھی کبھی نشستوں یا رؤساء کی محفلوں میں شعر گوئی پر داد و تحسین کی آوازیں بلند ہوتی تھیں جن میں ایک قسم کی تنقید پوشیدہ رہتی تھی نو آزمودہ شاعر اساتذہ کو، اصلاح کے لئے اپنا کلام ضرور دکھاتے تھے، جس پر ان کی اصلاحیں ایک قسم کی تنقید ہی ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ پڑھے لکھے لوگ اپنے دوستوں اور عزیزوں کو جو خطوط تحریر کرتے تھے ان میں بھی ہم عصروں کے کلام پر تبصرے موجود ہوتے تھے۔ اور پھر تذکروں کے وجود میں آجانے کے بعد شعراء کے کلام پر ایک قسم کی رائے بھی آنے لگی جس نے تنقید کی ترقی میں اہم رول ادا کیا۔

فائز، جن کا زمانہ ۱۷۱۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ اپنے دیوان کے خطبے میں اردو نظم کے بارے میں چند اصولوں کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شعر میں جدت اور لطافت ضروری ہے۔ شعر کی زبان جتنی صاف۔ سادہ اور شیریں ہوگی۔ اتنا ہی متاثر کن ہوگا۔ شعر کو حشو و زواید سے پاک ہونا چاہئے۔ مبتذل

الفاظ سے پرہیز کرنا چاہئے اور قدماء کے رویوں سے بھی باخبر رہنا چاہئے۔ شاعر کو عروض سے بھی باخبر رہنا ضروری ہے۔ دوراز کار تشبیہوں، استعاروں۔ غیر فصیح محاوروں اور ابہام سے کلام کو پاک ہونا چاہئے۔

شاہ مبارک آبرو جن کے بارے میں محمد حسین آزاد فرماتے ہیں کہ ''کلام سے ایسا تراوش ہوتا ہے کہ صرف ونحو عربی کی جانتے تھے اور مسائل علمی سے بھی بے خبر نہ تھے۔'' فارسی افعال ترک کرنے پر زور دیتے ہیں۔

جو کہ لاوے ریختہ میں فارسی کے فعل وحرف

لغو ہیں گے فصل اس کے ریختہ میں صرف ہے

شاہ حاتم نے بھی ''دیوان زادہ'' کے مقدمے میں ایسے اشارے دئے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ زبان کی اصلاح کا کام، ان کے زمانے سے ہی شروع ہو گیا تھا اور مشکل ہندی الفاظ کے بجائے عربی فارسی کے عام فہم لفظوں کے استعمال پر توجہ دی جانے لگی تھی۔ اس کے علاوہ محمد رفیع سودا نے بھی اردو تنقید پر دو کتابیں ''عبرالغافلین'' اور ''سبیلِ ہدایت'' تحریر کی ہیں اور اپنے قصیدوں میں بھی اردو شاعری کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔

ڈاکٹر مسیح الزماں نے اردو تنقید کی تاریخ میں تحریر فرمایا ہے کہ ''اس ابتدائی زمانے میں شعر کے متعلق کوئی تحریر نہیں ملتی تاہم اس زمانے کے شعراء کے ذہن میں شعر کے حسن وقبح کا جو معیار تھا اس کا اظہار ہمیں جگہ جگہ ضمنی طور پر مل جاتا ہے غالباً اس قسم کا پہلا بیان ملا وجہی کی ''قطب مشتری'' (۱۰۱۸ ھجری) میں ہے۔''

جسے بات کے ربط کا نام نئیں   اسے شعر کہنے سوں کچھ کام نئیں

اسی لفظ کوں شعر میں لیائے توں   کہ لیا یا ہے اوستاد جس لفظ کوں

شعر گرچہ کئی لوگ جوڑے اہیں　　میرے بہوت ہو خوب تھوڑے اہیں

ان اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ کلام کو سلیس اور مربوط ہونا چاہئے ایک اچھا شعر زیادہ مہمل اشعار سے بہتر ہے۔ زبان و بیان میں اپنے استادوں کی پیروی کرنا چاہئے۔ آرائش و زیبائش شعر کا زیور ہے۔ اس سے برے شعر بھی اچھے ہو جاتے ہیں،

اردو تذکرہ نویسی بھی فارسی تذکروں سے مستعار ہے، تبصرہ نگاروں نے ابتداً چند سطروں میں شاعر کے حالات زندگی بیان کر کے انتخاب کلام کو پیش کر دیا ہے یا کہیں کہیں چند سطروں میں کلام پر رائے زنی کر دی ہے۔ تذکروں کے علاوہ باذوق حضرات نجی طور پر بیاض بھی ترتیب دیتے تھے۔ جس میں اپنی پسند کے مطابق شاعر کا نام مختصر حالات اور اشعار جمع کر لیتے تھے۔ اگرچہ تذکرے اور بیاض ذاتی نوعیت کی ہوتی تھیں لیکن ان میں بھی کہیں کہیں تنقیدی جھلک سامنے آجاتی تھی۔

میر تقی میر کا تذکرہ ''نکات الشعراء'' مصحفی کا ''تذکرۂ ہندی'' قائم کا مخزن نکات'' میر حسن کا ''شعرائے اردو'' مرزا لطف علی کا '' گلشنِ ہند'' قائم کا ''مجموعہ نغز'' لچھمی نارئن شفیق کا ''چمنستان شعراء'' شیفتہ کا گلشن بے خار' کریم الدین کا ''طبقات الشعراء'' صابر کا ''گلستان سخن'' اور لالہ کیسری رام کا ''خمخانۂ جاوید'' کا شمار اردو کے اہم تذکروں میں کیا جاتا ہے۔ ان تذکروں میں شاعر کے حالات، مصنف کی رائے اور پھر انتخاب کلام پر زور دیا گیا ہے۔ بعض میں مولف اپنی پسند اور ناپسند کا شکار ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی تذکروں پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''تذکرے ایک خاص مقصد کے پیش نظر مرتب کئے جاتے تھے جس

میں شاعروں کے مختصر حالات اور کلام کے انتخاب کو اہمیت حاصل تھی۔ تنقیدی پہلو کو نمایاں کرنا ان کے لکھنے والوں کا مقصد نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان میں تنقیدی پہلو کی جھلکیاں نمایاں ہو گئی ہیں۔اسی تنقیدی پہلو سے اس زمانے کے معیار شعر وادب کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے"

لیکن ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے ان حالات کو بالکل بدل کرر کھ دیا راجے مہاراجے ،نواب اور جاگیر دار ، زمین دار اور تعلقدار انگریزوں کے اقتدار کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گئے ملک میں نئی ہوائیں چلیں، نئی برساتیں آئیں نئی کونپلیں پھوٹیں اور نئے پھل پھول شاخوں میں جھولنے لگے۔ان تبدیلیوں نے شعر وادب کو بھی متاثر کیا۔بادشاہ گئے تو قصیدہ گیا۔نواب گئے تو داستان امیر حمزہ اور طلسم ہوش ربا کا طلسم ٹوٹ گیا۔غزل کی دراز زلفوں پر فرنگی کی نگاہ بد پڑی تو وہ آنچل میں چھپنے پر مجبور ہو گئی۔اس طرح پرانی دنیا اجڑ گئی اور نئی بستیاں آباد ہونے لگیں۔ان تبدیلیوں کو سب سے پہلے سر سید احمد خان کی جاگتی آنکھوں اور بیدار ذہن نے محسوس کیا،انھوں نے اصلاحی تحریک کے ذریعہ سے مسلمانوں کو سماجی، اقتصادی معاشی اور تعلیمی اعتبار سے بلندیوں تک لے جانے کا فیصلہ کیا۔

انھوں نے فرمایا--"ہم نے تمام معاملات زندگی میں بلکہ بعض امور مذہبی میں بھی ہزاروں رسمیں غیر قوموں کی۔بہ سبب ملاپ اختیار کر لی ہیں، مگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم اپنے طریق معاشرت وتمدن کو اعلیٰ درجے کی تہذیب پر پہنچائیں تاکہ جو قومیں ہم سے زیادہ مہذب ہیں وہ ہم کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی رسومات وعادات بہ نظر تحقیق دیکھیں اور جو بری ہوں ان کو چھوڑ دیں اور جو قابل اصلاح ہوں ان کو قبول کریں"

مسلمانوں کی اصلاح کے لئے سر سید نے رسالے نکالے سائنٹی فک

سوسائٹی قائم کی، مضامین تحریر کئے۔ تقریریں کیں۔ بحث ومباحثے شروع کئے اور پھر علی گڑھ یونی ورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ ان کی کوششوں کے نتیجے میں مسلمانوں میں بیداری آئی اور شعر وادب نے نئے افکار کو قبول کیا۔

سرسید نے جو درخت لگایا تھا۔ حالی۔ آزاد اور شبلی اسی درخت کے شیریں ثمر ہیں، ان اکابرین نے جدید افکار کو قبول کر کے اپنے مضامین اور اشعار کے ذریعہ ادب کو زندگی سے قریب کرنے کی کوشش کی اور ادب کو طبقہ اشراف سے نکال کر متوسط طبقے کی ترجمانی کرنے پر زور قلم صرف کیا طرز ادا میں سادگی اور ندرت آگئی۔ سلیس اور رواں نثر کا چلن بڑھنے لگا، نئے نئے اصناف ادب وجود میں آگئے اور فکر وخیال کے نئے سانچے چاک پر ڈھلنے لگے۔ اصلاح زندگی کے ساتھ اصلاح ادب کے جذبے نے تنقید کو جنم دیا اور شعر وادب کے اصول متعین کرنے کے ساتھ ساتھ اس کا جائزہ بھی لیا جانے لگا۔

مولانا حالی اگرچہ شاعری سوانح اور مقالات کے مرد میدان ہیں لیکن وہ ایک بڑے ناقد بھی ہیں۔ مقدمہ شعر وشاعری ان کی تنقید کی کتاب ہے۔ سوانح نگاری اور مقالات میں بھی ان کی تنقیدیں قابل غور ہیں۔ مقدمہ شعر وشاعری کے ذریعہ سے حالی نے تنقید کے اصول متعین کیئے ہیں اور شعر وشاعری کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے،

ڈاکٹر عبدالحق فرماتے ہیں:

''مقدمہ شعر وشاعری میں شاعری کی ماہیت، حیات اور سماج سے اس کا تعلق، اس کے لوازم، زبان کے مسائل، اردو شاعری کے اصناف سخن، ان کے عیوب ومحاسن اور اصلاح پر بہت معقول اور مفکرانہ بحث کی ہے۔ اردو زبان پر تنقید کی یہ پہلی کتاب ہے اور اس موضوع پر اب تک اس سے بہتر کوئی کتاب

نہیں لکھی گئی۔"

شبلی نعمانی اگر چہ تاریخ مذہب اور ادب کے مرد میدان ہیں لیکن انھوں نے "شعر العجم" "موازنۂ انیس و دبیر اور سوانح مولانا روم میں مولانا حالی ہی کی طرح نظری اور عملی دونوں طرح کی تنقیدوں پر زور دیا ہے۔

محمد حسین آزاد جدید تنقید کے قافلہ سالار ہیں۔ اگر چہ ان کی تنقیدی کتاب جسے تذکرہ بھی کہا جاتا ہے، آب حیات پر حالی اور شبلی کے تنقیدی افکار و خیالات کے اثرات نمایاں ہیں لیکن یہ اردو ادب کی ایک تاریخ بھی ہے۔ جس میں شعراء کے حالات زندگی، ان کا کلام، کلام پر تنقید و تبصرہ اور شعراء کے مابین پیش آنے والے ادبی معرکوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ آب حیات کے ذریعہ آزاد نے تذکرے کو تاریخی حیثیت سے پیش کیا اور شعراء کے کلام پر اپنی رائے بھی ظاہر کی اور بعض شعراء کو بعض پر سبقت دینے کی بھی کوشش کی، لیکن اپنی خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود آب حیات اردو ادب کی تاریخ پر قلم اٹھانے والوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئی ہے۔

حالی، شبلی اور آزاد کے اثرات نئے ادیبوں نے بھی قبول کئے اور مقدمہ شعر و شاعری، شعر العجم اور آب حیات کی تنقیدوں کے سائے میں تنقیدی ادب پیش کرنا شروع کر دیا۔ مولانا وحید الدین سلیم پانی پتی، امداد امام اثر، مہدی افادی، عبد الحق، پروفیسر محمود شیرانی، حبیب الرحمٰن خان شیروانی، مسعود حسن رضوی ادیب، ڈاکٹر محی الدین زور، عبد الرحمٰن بجنوری، کلیم الدین احمد، آل احمد سرور۔ احتشام حسین اور بہت سے چھوٹے بڑے ناقدین نے تنقیدی مضامین اور کتب میں مزید اضافے کئے اور تنقید کے نئے میدان تلاش کرنے کی کوشش کی۔ حالی کی مقدمہ شعر و شاعری سے اردو ادب و تنقید پر مغربی اثرات بھی پڑنے لگے

تھے۔ اگرچہ حالیؔ انگریزی زبان سے واقف نہیں تھے۔ لیکن انھوں نے عربی زبان سے مغربی تنقید وادب کا تھوڑا بہت مطالعہ ضرور کر لیا تھا۔ اسی طرح شبلی نے بھی مغربی تنقید سے واقفیت کی ناکام کوشش کی، لیکن ان ناقدین کے بعد جو نسل تنقیدی میدان میں اتری وہ انگریزی زبان سے بھی واقف تھی اور مغربی ادبیات سے بھی متعارف تھی، اس نسل نے مغربی تنقید سے اردو زبان وادب میں مزید اضافے کئے اور اردو تنقید کو نئے میدانوں سے آشنا کرایا۔

یہ اردو تنقید کا ایک سرسری مطالعہ ہے۔ اس کے علاوہ ناقدین نے تنقید کو جمالیاتی، وجدانی، تاثراتی، نفسیاتی، تاریخی' ماحولی، عملی، مارکسی مغربی اور سائنسی ناموں سے بھی یاد کیا ہے۔

آئندہ صفحات میں آپ دیکھیں گے کہ اردو تنقید کے اس روایتی سفر کے علاوہ بھی کچھ راستے ہیں جن پر چل کر شاید ہم اردو تنقید کے نئے میدان تلاش کر سکیں۔

"تنقید میں تحریک اور پسند کا مسئلہ"

ابھی چند سال پہلے عالمی ادب کی بساط پر ایک واقعہ پیش آیا ہے۔

روسی ادیب پاسترناک نے "ڈاکٹر زواگو" کے عنوان سے ایک ناول لکھا۔ اس ناول پر یورپ کی سرمایہ دارانہ سوسائٹی کی طرف سے مصنف کو ادب کا نوبل پرائز دیا گیا۔ لیکن اس ناول پر روس کے کمیونسٹ ادیبوں نے اسے اپنی برادری سے خارج کر دیا۔

"ڈاکٹر زواگو" میں سرمایہ داری کے حق میں کچھ نہیں لکھا گیا ہے، لیکن کمیونزم کے قیام میں جو دشواریاں اور کمزوریاں پیش آتی رہی ہیں، ان کا ذکر ہے۔ غیر کمیونسٹ سماج کے لئے اتنی بات بھی مفید ہو سکتی تھی۔ بہت سے لوگ کمیونزم کی طرف سے بدگمان ہو سکتے تھے۔ سرمایہ دارانہ ادب کیلئے ڈاکٹر زواگو انعام کا مستحق قرار پایا۔

ایک ایسا ناول جو یورپ کے سرمایہ دار ادیبوں اور تنقید نگاروں کے لئے

انعام کا مستحق تھا، روس کے کمیونسٹ ادیبوں اور تنقید نگاروں کی نظر میں نا قابل معافی جرم بن گیا۔

تنقید کے اصول کیا ہو گئے؟ پوری دنیا میں اس ناول پر بحث ہوئی اور پوری دنیا کے ناقدین دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔

کیا اردو ادب میں تحریک کار فرما نہیں ہے؟

"ہے"--اردو کا ادیب اور ناقد بھی سیاسی مزاج رکھتے ہیں، جب اردو ادب کو پرکھتے ہیں تو اپنے سیاسی مزاج کو صندوق یا باکس میں مقفل نہیں کرتے، ادب کو جس کسوٹی پر کستے ہیں وہ نوے فیصدی سیاسی ہوتی ہے۔ تنقید پر بھی اس سیاسی مزاج کا اثر پڑتا ہے۔

"ادب کو زندگی کی حقیقتوں کا آئینہ دار ہونا چاہئے"--یہ جملہ تنقید نگاروں کا ہے۔

لیکن زندگی کی حقیقتوں کا مطلب کیا ہے۔؟ حقیقتوں کا تعین ہو چکا یا نہیں؟ ڈاکٹر ژواگو زندگی کی حقیقتوں کا آئینہ دار ہے یا نہیں؟

یورپ کے سرمایہ دار تنقید نگاروں کا جواب ہے--"ہے"

روس کے کمیونسٹ ناقدین کا جواب ہے--"نہیں ہے"

اور یہ تقسیم ہندوستان میں بھی موجود ہے۔ یہاں بھی دونوں جواب مل جاتے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ-"زندگی کی حقیقتیں"۔ محض ایک اصطلاح ہے۔ اس کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ معنی ہیں تو تعبیریں بہت ہیں، تشریحیں بہت ہیں۔ ایک ایسی سوسائٹی جیسی کہ ہندوستان میں ہے اور جس میں اردو ادب پیدا ہو رہا ہے۔ تنقید کوئی مستند ترازو پیش نہیں کر سکتی۔ ہندوستانی سماج مختلف طبقوں میں بٹا ہوا ہے۔ یہاں بہت بڑے بڑے سرمایہ دار اور ان کے پروردہ اہل علم موجود

ہیں۔ یہاں متوسط طبقہ اور اس کے اہل نظر ادبی سرگرمیوں میں موجود ہیں۔ یہاں ذہین لوگ بھی ہیں جو دشوار زندگی سے گزر رہے ہیں اور اپنے لئے کسی روشن مستقبل سے مایوس ہیں۔

اسی طرح مختلف سیاسی پارٹیاں ہیں، وہ اپنے طبقوں کی نمایندگی کرتی ہیں، اس نمایندگی میں ان کے ادیب اور ناقد بھی موجود ہیں، جیسی کشمکش سیاست میں ہے اتنی ہی ادب میں بھی۔ اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادبی زندگی میں سرمایہ داروں کے دستر خوان والے ادیبوں سے لیکر فٹ پاتھ پر غریبوں کے ساتھ سونے والے ادیب تک موجود ہیں۔

اس لمبے اور بے ڈول ڈھانچے میں ادب میں۔ ''زندگی کی حقیقتیں'' کیسے تلاش کی جائیں اور ادب کے لئے تنقید کے اصول کیسے بنائے جائیں؟

کیا ہندوستانی سماج میں رہ کر کوئی پڑھا لکھا آدمی غیر جانب دار رہ سکتا ہے۔؟

میرا خیال ہے کہ نہیں رہ سکتا،

تنقید نگار بھی غیر جانب دار نہیں رہ سکتا۔ اسے رہنا بھی نہیں چاہئے۔ لیکن اردو کے تنقید نگار کچھ مجبور ولاچار قسم کے لوگ بھی ہیں، ان کی اپنی ضرورتیں اور معاشی دشواریاں ہیں، وہ ابھی تک سرمایہ داری کے ساتھ صلح صفائی کے ساتھ رہنے کے قائل ہیں۔ بیچ کی راہ نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس کوشش میں ہر تنقیدی مضمون خسرو کی پہیلی ہو کر رہ جاتا ہے۔

ضرورت ہے کہ اردو ادب کو ترقی اور زندگی کے پیمانے سے ناپا جائے ترقی اور زندگی کا پیمانہ یہ ہے کہ اردو ادب عوام کو سرمایہ داری کے شکنجے سے چھڑانے کی خدمت کہاں تک انجام دے رہا ہے۔

یہ مسئلہ بہت زیادہ اہم نہیں ہے اگر ایک مرتبہ صاف صاف یہ اصول بنالیا جائے کہ کسی صورت میں بھی سرمایہ داری کی مدد کرنے والا ادب، تنقید کی چھری سے کاٹ کر پھینک دینے کے قابل ہے اور عوام کو سوشلزم اور سماجی انصاف کی طرف لے جانے والا ادب ہی زندہ رہنے کے قابل ہے تو ادیب اور ناقد دونوں بہت سی غیر ضروری تاویلوں سے بچ جائیں گے۔

صفائی نہ ہونے کی وجہ سے اردو ناقدین کے چہرے بھی نقاب میں چھپے ہوئے ہیں۔ وہ تنقید نگار جو عوام کی طرف آنا چاہتے ہیں استعاروں کا سہارا لینے لگتے ہیں اور ان کی اپنی رائے مصلحت کے ردّی کاغذ کے نیچے دب کر رہ جاتی ہے۔

مختصراً میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ناقد پڑھا لکھا انسان ہوتا ہے ملک کے سیاسی مسائل کے بارے میں اس کی ایک رائے ہوتی ہے۔ کسی سیاسی تحریک میں باقاعدہ شامل نہ ہونے پر بھی ذہنی طور پر کسی تحریک سے وابستہ ہوتا ہے اور اس کی پوری تنقید اسی تحریک کے دائرے میں گردش کرتی رہتی ہے۔

اس بات کو صاف صاف کہ دینا چاہئے کہ ادب سیاست سے الگ نہیں کیا جا سکتا اور تنقید بھی سیاست سے الگ نہیں ہو سکتی۔
اس کا ایک اور پہلو بھی توجہ کے قابل ہے۔

''تنقید اور پسند''

ادب میں پسند کا بھی ایک مقام ہے اور تنقید کے لئے پسند سے بچنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ کوئی تنقید نگار اپنی پسند کو ذبح نہیں کر سکتا دیانت داری کے اعلان کے باوجود ہر تنقید میں پسند کار فرما نظر آئیگی۔

ممکن ہے ادب پر تنقید کرتے وقت دیانت داری سے کام لیا جائے لیکن تنقید کے لئے ادب کا انتخاب کرتے وقت اُسی ادیب کو چنا جاتا ہے جو تنقید نگار کو پسند ہے۔ ہاں کبھی کبھی ناپسند ادیب کا بھی انتخاب ہو جاتا ہے لیکن ایسے ادیب پر تنقید کم ہوتی ہے۔ ملامت زیادہ۔

میرا خیال ہے کہ تنقید بغیر پسند کے ہو ہی نہیں سکتی۔ اچھا اور بُرا اس کا فیصلہ کس طرح کیا جائے گا؟

مثلاً--ایک ہوٹل میں دس بارہ آدمی چائے پی رہے ہیں۔ ہوٹل والے نے سب کے لئے ایک طرح کی چائے بنا کر رکھ دی۔ یہ چائے اچھی بنی ہے یا بری--اس کا فیصلہ کیسے ہو گا؟

لیجئے، ایک صاحب بولے --"ذرا ایک چمچہ شکر اور دینا"

دوسرے بولے --"یہ چائے نہیں لپٹن کا مربہ ہے"

تیسرے نے کہا --"بہت لائٹ ہے"

چوتھے نے فرمایا --"بہت اسٹرانگ ہے"

پانچواں بولا --"آپ نمک کیوں نہیں ڈالتے ہیں"

چھٹا بولا --"تازی پتی نہیں لگائی ہے۔"

"کیا روزمرہ کی زندگی میں ہم یہ باتیں نہیں سنتے"؟

کیا چائے کی اس تنقید میں پسند شامل نہیں ہے؟

اسی طرح زندگی کی دوسری ضرورتوں میں بھی ہم پسند کو کارفرما دیکھتے ہیں۔ کپڑے، کھیل کود، کھانا پینا، حسن و عشق، پڑھنا لکھنا، --سب میں پسند موجود ہے۔

ظاہر ہے کہ پڑھتے لکھتے وقت بھی ہم پسند سے کام لیتے ہیں کسی کو ناول سے ذوق ہے کوئی شاعری کا دلدادہ ہے۔ کوئی اخبار پڑھ رہا ہے اور کوئی تنقید و تاریخ کی ورق گردانی میں مبتلا ہے۔ پھر ان مضامین میں بھی ادیب بٹے ہوئے ہیں -کوئی کسی ناول نگار کو پسند کرتا ہے اور کوئی کسی کو۔ کسی کا کوئی پسندیدہ شاعر ہے اور کسی کا کوئی 'عوام سے آگے بڑھ کر یہ بات خواص تک جاتی ہے اور پھر ان تنقید نگاروں تک بھی جو تنقید میں دیانت داری کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔

دیانت داری کے اعلان کے باوجود پسند کا مقام یہاں بھی بلند رہتا ہے۔ افسانوں میں چند افسانہ نگاروں کے نام کسی تنقید نگار کے یہاں ملتے ہیں اور چند نام کسی کے یہاں۔

اسی طرح ناول نگاروں میں بھی تنقید نگاروں کے چند پسندیدہ ناول نگار

ہیں، جدید اور قدیم ناولوں کے سلسلے میں صرف اتنے ہی ناول نگاروں کا ذکر آتا ہے۔

کوئی تنقید نگار بھی ہمارے اس ماحول کے باہر سے نہیں آیا۔ سب اسی سوسائٹی کے پالے ہوئے ہیں۔ ماحول کی وارثت سب کو ملتی ہے۔ کوئی ناقد بھی آج کے ماحول میں غیر جانب دار نہیں ہے اور نہ تنقید میں اس دیانت داری سے کام لے سکتا ہے جس کا خود ہی اعلان کرتا رہتا ہے۔

لیکن پسند کیسے بنتی ہے؟ تنقید نگار کسی ادیب کو کیوں پسند کرتا ہے۔ اس کا دوسرا ہی سبب ہے۔ دوسرا نہیں بلکہ بہت سے اسباب ہیں۔ سیاسی، مذہبی، قومی اور نفسیاتی اسباب۔

”زبان اور تنقید“

عربوں اور ہندوستانیوں کے تجارتی تعلقات صدیوں پرانے ہیں، اس لئے ہندوستان کی سنسکرت اور عربوں کی زبان عربی ایک دوسرے سے متعارف ہیں، بلکہ دونوں زبانوں کے ایک دوسرے پر اثرات بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ محمود غزنوی اور محمد غوری سے قبل ہی بعض عرب قبائل اور سادات ایران سے ہندوستان آکر آباد ہو گئے تھے۔ دوسری طرف بہت سے بزرگان دین بھی تبلیغ اسلام کے لئے ہندوستان پہنچنے لگے تھے۔، چنانچہ حضرت خواجہ معین الدین سنجری، حضرت فرید الدین گنج شکر، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور حضرت نظام الدین خالدی نے اردو کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان بزرگان دین اور عرب قبائل کی زبان زیادہ تر فارسی تھی اس لئے ہندوستان کی مادری زبانوں میں عربی کے بعد فارسی کے اثرات و الفاظ شامل ہونے لگے۔ اگر عہد غزنوی سے

فارسی اثرات کی ابتداء سمجھیں تو گویا پانچویں صدی سے تیرہویں صدی تک فارسی نے ہندوستان پر حکمرانی کی لیکن مغلوں کے عہد میں فارسی نے عروج حاصل کر لیا اور اہل ہنود بھی مغل درباروں میں فارسی کے استاد قرار پائے، دوسری طرف سنسکرت اور بھاشا میں مسلمانوں نے بھی کمال کی دسترس حاصل کر لی جس کی تفصیل آئندہ صفحات میں موجود ہے۔ عبدالمالک آروی رقمطراز ہیں۔

> "صدیوں کی اسلامی حکومت، عربی و فارسی قبائل کی ہجرت اخلاق و معاشرت کی تقلید اختلاط نے عربی فارسی اور بھاشا کے امتزاج سے ایک چوتھی زبان تیار کی جسے ہندوستانی کہئے یا اردو لفظ "اردو" بذات خود دور ارتقاء ہی کی پیداوار ہے، یہ نہ عربی ہے نہ فارسی، اردو جس قوم کی زبان کا لفظ ہے، وہ اسلامی مبلغ بن کر نہیں آئی تھی بلکہ ملک گیری کی ہوس پیمایئوں اور استعماری دست درازیوں نے اس کو ہندوستان میں بھیجا۔ اس قوم کے داخلے سے قبل مسلمانوں کی حکومت یہاں قائم ہو چکی تھی، ظاہر ہے کہ اگر مسلمان اشاعت دین کے لئے ہندوستان میں آباد نہ ہوتے تو بھی مغلوں کا حملہ ہوتا اور اس صورت سے لفظ اردو کا بھاشا میں داخل ہونا ضروری تھا۔ اس لئے نتیجہ نکلتا ہے کہ لفظ اردو پر کشمکش حیات کا ایک اثر باقی ہے"

ہم اردو زبان کی ابتدائی شکل کو زیادہ سے زیادہ پانچ چھ سو سال پہلے تک لے جا سکتے ہیں۔ تاریخ نگاروں نے قوموں کی زندگی کے لئے زبان کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی ہے۔ اس لئے انھوں نے ایک قوم کی زبان کے دوسری قوم کی زبان پر اثرات کا بہت زیادہ تفصیلی جائزہ نہیں لیا ہے۔

ابن خلدون پہلا شخص ہے جس نے تاریخ اور تاریخ ساز اسباب کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے لیکن ان اسباب میں زبان کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی ہے۔

ہم جس ملک میں رہتے ہیں اس کی کوئی مستند تاریخ نہیں ہے۔ بہت ہی پرانی تحریری کتاب جس میں تاریخ موجود ہے مہابھارت کے واقعات اور کرشن جی کی گیتا ہے۔ لیکن وہ بھی تاریخ کے لئے نہیں دھرم کے لئے لکھی گئی ہے اس لئے تاریخی واقعات مشکوک اور افسانوی ہو گئے ہیں۔

حضرت عیسیٰ سے تقریباً سولہ سو سال قبل ہندیورپی آریہ شمالی ایران اور باختر کے میدانی علاقوں میں آکر آباد ہوئے، یہ لوگ سندھ گھاٹی میں آباد عوام سے مہذب ترقی یافتہ اور خوبصورت تھے، ان کا رنگ گورا تھا، گھوڑ سواری رتھ اور زراعت کا استعمال بھی جانتے تھے، مویشی ان کی تجارت اور دولت کا ذریعہ تھے، جبکہ سندھ گھاٹی کے لوگ صرف بیل گاڑی کے استعمال کو جانتے تھے۔ آریوں نے سندھ گھاٹی کے عوام کو زیر کر لیا اور اپنی برتری قائم کر کے انھیں داس بنالیا۔

تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح میں آریہ تین طبقوں میں منقسم ہو گئے۔ پہلے طبقے میں برہمن تھا جسے سماج میں بڑی اہمیت حاصل تھی، اس کا درجہ دیوتاؤں جیسا تھا، جو ذرا سی بات پر بادشاہ اور اس کی فوج کو برباد کر سکتا تھا۔ اسے بڑی بڑی زمینیں حاصل تھیں جن پر اپنے داسوں کے ذریعہ سے کاشت کرواتا۔ ان کا کام تعلیم دینا اور پاک وصاف زندگی گزارنا تھا۔، برہمن تجارت بھی کرتے تھے اور سرکاری ملازمتوں میں بھی تھے، منو کے مطابق برہمن سودی کاروبار بھی کر سکتے تھے۔

جنگجو افراد کو راجن یا چھتری کہا جاتا ہے۔ پالی ادب میں چھتریوں کو

برہمن پر فوقیت حاصل تھی۔ موریہ عہد کے بعد برہمنوں کی نظریاتی حیثیت پورے شمالی ہندوستان پر قائم ہو چکی تھی۔ چھتریوں کی زندگی برہمنوں کی طرح مثالی نہیں تھی یہ تاجر اور دستکار بھی تھے اور اپنی مرضی سے شادیاں کرنے کا اختیار تھا

تیسرا طبقہ ویش کا تھا۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ "اسے دوسروں کو نذر گزرانی ہے، دوسروں ہی پر زندگی گزارنی ہے۔ اور جسے مرضی کے مطابق پریشان کیا جا سکتا ہے۔ اور ستایا بھی جا سکتا ہے" برہمنی ادب سے پتہ چلتا ہے کہ ویش گھٹیا، مردود، معمولی کاشتکار اور تاجر تھا۔

چوتھا طبقہ شودروں کا تھا۔ آریہ سماج میں ان کا درجہ بہت پست تھا یہ دوسرے درجے کے شہری تھے، برہمن کتابوں کے مطابق -خالص شودروں کے فرائض منصبی میں یہ شامل تھا کہ وہ اپنے سے برتر تینوں طبقوں کی خدمت کریں جھوٹا کھانا کھائیں۔ اترن پہنیں اور پرانے اسباب استعمال کریں۔ قانون نے ان کی زندگی کی کوئی قیمت مقرر نہیں کی تھی۔

آریہ سنسکرت زبان بولتے تھے۔ ان کی تخلیقات کو ویدوں کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ہندوستان میں آریوں کی آمد کا سلسلہ صدیوں تک چلتا رہا۔ نو سو صدی قبل مسیح کے قریب انھوں نے پنجاب سے مشرق کے زرخیز علاقوں کی طرف پیش قدمی شروع کی اور گنگا کے دوآبے میں داخل ہو گئے آریوں نے جہاں جہاں قیام کیا، وہاں کے عوام پر اپنی زبان و تہذیب کے نقش چھوڑتے رہے۔

آریہ مغرور اور باعظمت قوم تھی۔ اسے اپنی زبان کی برتری کا احساس تھا اسی لئے اس نے دوسری زبانوں کے مقابلے پر اپنی زبان کو منجھی ہوئی یا ادبی زبان کا خطاب عطا فرمایا، سنسکرت کو انھوں نے دیوبانی یعنی دیوتاؤں کی زبان بھی کہا۔

زبان کے بارے میں اس قوم کا وہی نظریہ تھا جو ایک دوسری وسط ایشیائی قوم بنی اسرائیل یا یہود کا تھا۔ وہ بھی اپنی زبان کو اعلیٰ وافضل سمجھتے تھے۔ اس میں کسی دوسری زبان کے میل کو پسند نہیں کرتے تھے۔

خاندان ابراہیم کی ایک دوسری شاخ یعنی بنی اسرائیل عرب میں آباد ہوئے انھیں بھی عربی زبان کی عظمت کا دعویٰ تھا۔ اپنی زبان کو علمی زبان مان کر انھوں نے باقی دنیا کو "عجمی" یعنی گونگا کا خطاب دے رکھا تھا۔

بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل کے روایتی علاقے عراق اور ایران کے مغربی حصے تھے، ممکن ہے کہ آریہ قوم بھی انھیں کے قریب سے نکلی ہو۔ بہر حال وہ ایران میں تو موجود ہی تھی۔ مذہب روایت شکل وصورت اور زبان کے بارے میں -- تینوں کا نظریہ قریب قریب مشترک تھا۔

جب اس قوم نے ہندوستان پر قبضہ کر لیا تو یہاں کے لوگ اور یہاں کی زبانیں غلام ہو گئیں۔ ان غلاموں کو "دیوبانی" سنسکرت بولنے کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقامی زبانوں نے بڑی تیزی سے سنسکرت میں شامل ہونا شروع کر دیا یا سنسکرت کے الفاظ داسوں کی زبان پر چڑھ کر ان کی روزمرہ کی ضرورتوں میں استعمال ہونے لگے۔

یہ مشکل وسط ایشیا میں بنی اسرائیل کو پیش آئی تو انھوں نے دوسری زبانیں بولنے والی عورتوں کو چھوڑ دینے کا حکم دیا کیونکہ ان کے بچے ملی جلی زبانیں بولنے لگے تھے آریوں نے بھی اس معاملے میں سختی سے کام لیا اور داسوں کے لئے سنسکرت کا سننا تک خلاف قانون بنا دیا یہاں تک کہ اگر وہ سنسکرت سُن لیں تو ان کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیل دینے کی سزا بھی رکھی۔

مگر داسوں سے گفتگو کیسے کی گئی ہو گی؟

معلوم ہوتا ہے کہ آریوں نے سنسکرت کو علمی زبان بنا کر محفوظ کر دیا ہوگا اور روز مرہ کی زندگی میں داسوں کی زبان اختیار کر لی ہوگی۔ یہ اس لئے بھی ممکن ہے کہ سیکڑوں سال کی مسلسل جدوجہد نے شمالی ہندوستان میں کتنی ہی نئی زبانیں پیدا کر دیں اور سنسکرت صرف اہل علم اور اہل مذہب کی زبان ہو کر رہ گئی۔ آریہ عوام بھی اپنی باعظمت زبان کو چھوڑ بیٹھے۔

اس طرح یہ بات سامنے آتی ہے کہ مقامی زبانیں سنسکرت سے نہیں نکلیں بلکہ ان کی بنیاد خود ان ہی کی زبانوں کے باہمی میل ملاپ پر قائم ہوئی رفتہ رفتہ سنسکرت میدان سے ہٹ گئی اور پھر آج تک عوامی زبان کی شکل میں اس کا ذکر نہیں آیا،

گزشتہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ آریوں کی آمد کے بعد بھی ہندوستان میں نئی قوموں کے آنے کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ قومیں بھی شمال سے آئیں اور اپنی زبانیں بھی ساتھ لائیں۔ لیکن انھوں نے اپنی زبانوں کے بارے میں تعصب سے کام نہیں لیا۔ ان کی زبانیں مقامی زبانوں میں شامل ہوگئیں۔ نئے آنے والے تبتی، چینی، منگول، ترک۔ قازق، ازبک، ایرانی یونانی اور افغانی تھے، ان کی اپنی اپنی زبانیں تھیں اور یہ زبانیں شمالی ہند کی زبانوں میں گھل مل کر اپنی ساخت اور تلفظ کو بدل کر کچھ کی کچھ بن گئیں۔ بقول محمد حسین آزاد ۔۔ سوں، سیں اور سیتی' سے بن گیا۔ بھیتر، اندر بن گیا مجھ دل کی جگہ میرا دل آگیا۔ ہمن کو کی جگہ ہم کو بولا جانے لگا۔ موہن پی اور پیتم معشوق کی شکل میں سامنے آیا۔ اسی طرح نین، آنکھ، دہن، دہن، بچن، کلام۔ نت ہمیشہ، مکھ۔ منہ۔ جگ، جہاں۔ مرض، مرض۔ بگانا۔ بیگانہ۔ اور یوہ، یہ کہا جانے لگا۔

اس طرح الفاظ اپنی شکل اور تلفظ بدلتے رہے، اپنی اصل چھوڑ کر زبان

کے نئے خاندانوں میں شامل ہوتے رہے اور ان تمام تبدیلیوں میں وسط ایشیا سے آنے والی زبانوں کا سرمایہ برابر بڑھتا رہا۔

دو ہزار سال سے پہلے اور ڈھائی ہزار سال کے اندر ہندوستان اور فارس۔ عراق۔ مغربی فلسطین اور یونان میں بڑی بڑی انقلابی تبدیلیاں پیش آئیں۔ ہندوستان میں مہاتما گوتم بدھ نے آریوں کے بنائے ہوئے برہمن ازم کی دھجیاں بکھیر دیں۔ وہ پورا ڈھانچہ ٹوٹ گیا جس میں سنسکرت اور برہمن کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کئے بغیر زندہ نہیں رہا جا سکتا تھا۔ گوتم بدھ نے سنسکرت کو چھوڑ دیا مذہبی زبان کی شکل میں روزمرہ کی زبان پالی کو عروج حاصل ہوا اور ذات پات کا نظام درہم برہم ہو گیا۔

شمال میں ایران اور ترکستان کے علاقے فارس اور میڈیا پر بابل (عراق) کا بادشاہ بخت نصر حکومت کرتا تھا لیکن ایک گمنام شخص کیخسرو یا سائرس یا ذوالقرنین نے میڈیا اور فارس کو فتح کر کے بابل اور یونان کو شکست دے دی۔ عراق پر قبضہ کر لیا اور یونان کو ایشیائے کوچک (ترکی) سے نکال کر بحر یونان میں ڈھکیل دیا۔

اس عظیم الشان بادشاہ اور سپہ سالار کا بیٹا دارا فارس کا بادشاہ ہوا۔ یہ بھی بڑا زبردست بادشاہ تھا اور پنجاب، سندھ اور افغانستان تک اس کی حکومت پھیل گئی تھی۔

شکست کھائے ہوئے یونانیوں کا نیا بادشاہ سکندر مقدونی یونان سے نکلا اور ایشیائے کوچک میں اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ فارس کی فوجوں کو شکست ہو گئی، سکندر فارس میں گھس آیا۔ دارا فرار ہوا اور معلوم ہوتا ہے کہ سکندر اس کے تعاقب میں پنجاب تک گھس آیا اور پنجاب کے راجہ پورس کو ۳۲۶ قبل مسیح میں شکست دے کر اپنے ایک سردار سلوکی کو پنجاب کا گورنر بنا کر

دارا کو گرفتار کر کے واپس چلا گیا۔

سکندر کے انتقال کے بعد پنجاب کی یونانی حکومت کا تعلق، یونان سے کٹ گیا۔ وہ تمام یونانی جو سلوکس کے ساتھ پنجاب میں تھے یہیں رہ گئے، چندر گپت موریہ بہار اور یوپی کا نیا راجہ ہوا۔ یہ راجہ اگرچہ سکندر جیسا فاتح تو نہیں تھا مگر اس سے بڑا منتظم حکمراں ضرور تھا وہ چھتری سردار تھا جسے مگدھ کے حکمراں نندا خاندان نے راجدھانی بدر کر دیا تھا، اس نے اپنے مشیر کوٹلیہ کی مدد سے چھوٹا سا لشکر ترتیب دیا اور تخت و تاج پر قبضہ کر کے موریہ خاندان کی بنیاد رکھی۔ اس خاندان نے ڈیڑھ سو برس تک ہندوستان اور افغانستان پر حکومت کی اور یہ اپنے عہد کی مظبوط ترین سلطنت تھی۔ موریہ نے سلوکس کو اپنی بیٹی دے کر رشتہ کر لیا اور اس طرح یونانی قوم اور زبان مقامی آبادی میں ضم ہو کر غائب ہو گئی۔

ہمیں نہیں معلوم کہ اس تلاطم میں شمالی ہند کی زبان پر دوسری زبانوں نے کیا اثر ڈالا۔ لیکن یہ بھی نہیں مانا جا سکتا کہ فارسی اور یونانی حکومتوں اور زبانوں نے مقامی زبانوں میں اپنی جگہ نہ بنائی ہو۔ لسانیات کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ جب دو الگ الگ زبانیں بولنے والی قومیں حاکم اور محکوم ہو جاتی ہیں تو دونوں زبانیں ایک دوسرے کو متاثر کرتی ہیں۔

دو ہزار سال پہلے تک ہندوستانی زبانوں میں یہ تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ پاٹلی پتر (بہار) کی پالی زبان کا عروج بدھ مذہب کے ساتھ ساتھ ہوا تھا۔ بدھ نے اپنی تعلیم کو عام کرنے کے لئے عوامی زبان پالی کو اختیار کیا دیو بانی سنسکرت کو گدی سے اتار دیا گیا۔

پالی نے پورے ملک کی زبانوں پر اثر ڈالا کیونکہ وہ بدھ حکمرانوں اور بھکشوؤں کی زبان تھی، بدھ مذہب کے پرچارک جنوبی ہندوستان اور افغانستان

تک پھیل گئے تھے۔ پالی اپنے ساتھ جنوبی ہندوستان اور افغانستان کی زبانوں کے الفاظ بھی لائی۔ اس طرح زبان میں پھر تبدیلیاں ہوئیں۔

۷۱۱ء میں محمد بن قاسم مسلم عرب سپہ سالار عربی زبان کے ساتھ سندھ میں داخل ہوا۔ اس نے ملتان تک سندھ اور پنجاب کو فتح کر لیا پنجاب اور سندھ عملاً عرب حکومت کے دو صوبے بن گئے۔ اور پہلی مرتبہ عربی زبان سندھ اور جنوبی پنجاب میں بولی گئی۔ سندھی زبان کے رسم الخط کو دیکھ کر عربی زبان کے گہرے اثرات کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ اثر سندھ پر گہرا پڑا۔ مقامی آبادی نے رسم الخط کو اختیار کر لیا لیکن پنجاب پر عربی کا اتنا گہرا اثر نہیں پڑا۔ الفاظ میں اضافہ ضرور ہو گیا۔

۱۰۰۱ء اور ۱۰۲۴ء کے درمیان محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے اور غزنوی کی آمد کے ساتھ ترکی زبان نے سندھ اور پنجاب کو اپنے اثر میں لے لیا۔ لیکن غزنوی کے ساتھ ترکی، فارسی، سندھی ازبک اور پشتو زبانیں بھی آئیں کیونکہ غزنوی کا لشکر ان زبانوں کے بولنے والے بڑے بڑے لشکری گروہوں سے ملکر بنا تھا۔

غزنوی نے بنارس تک اپنی فتوحات کو وسعت دی اجمیر، متھرا اور سوم ناتھ کو فتح کر لیا۔ اب ہندوستانی زبانوں کو نئی بولیوں سے واسطہ پڑا۔ حکمراں زبانوں کو استعمال کرنے والے سپاہی اور عہدیدار مقامی لوگوں سے اپنی ہی زبان میں بات کرنے لگے اور اشیاء کے ناموں سے لیکر آدمیوں کے ناموں تک سب کا ایک دوسرے کی زبان میں تبادلہ ہونے لگا۔

غزنوی کے خاندان والوں نے اپنا مرکز لاہور کو بنایا اور یہ سو سال کا زمانہ ہے کہ غزنوی کے لشکر، عہدیدار اور اہل خاندان لاہور پر حکومت کرتے رہے۔

ظاہر ہے کہ اب لاہور اور پنجاب کی زبان وہ نہیں رہی جو دو ہزار سال پہلے سلوکس کے زمانے میں تھی اس وقت یونانی زبان کے بگڑے ہوئے لفظوں کی کثرت تھی، اب فارسی، پشتو اور ترکی کے الفاظ کا سکہ چلنے لگا۔

غزنوی خاندان کے ایک سو سال بعد افغانستان کے پشتو اور فارسی بولنے والے خاندان غوری نے ۱۱۹۱ء میں ہندوستان پر حملہ کیا اور چند شدید لڑائیوں کے بعد دہلی، اجمیر، اور قنوج کو راجپوتوں سے چھین کر ہندوستان پر پٹھانوں کا پرچم لہرادیا، اس کا پہلا گورنر قطب الدین ایبک دہلی میں ٹھہرا۔

مسلم حکومت کا مرکز ابھی تک لاہور تھا اب آگے بڑھ کر دہلی ہو گیا۔ وہ زبان جو لاہور تک محدود تھی، دہلی تک پہنچ گئی۔ بازاروں میں افغان سپاہی پشتو اور فارسی میں گفتگو کرنے لگے اور ظاہر ہے کہ دہلی کی مقامی کھڑی بولی کے الفاظ خود بھی بولنے لگے۔ اس طرح راجپوتوں کی کھڑی بولی اور افغانوں کی پشتو اور فارسی ملکر دہلی میں ایک نئی زبان نے جنم لیا۔

اس تبدیلی کے بعد لمبے عرصے تک پشتو اور فارسی کی حکومت رہی کئی پٹھان خاندان حاکم ہوئے۔ حکومت بنگال۔ بہار اور آسام تک پھیل گئی۔ ادھر دکن میں بھی خلجی حکومت کے ساتھ فارسی اور پشتو پہنچی' ہندوستان کی سبھی مقامی زبانیں اور بولیاں فارسی اور پشتو سے متاثر ہوئیں، سبھی کو ایک ایسی زبان کی ضرورت محسوس ہوئی جس میں حاکم اور محکوم کھل کر بات کر سکیں۔

حاکموں کی دفتری زبان فارسی تھی مگر امدادی زبان ہندی بھی دفتروں میں موجود تھی۔ ہندی کا مطلب یہ تھا کہ مقامی زبان جو دیوناگری رسم الخط میں لکھی جائے ہندی نہ کوئی زبان تھی۔ نہ کہیں بولی جاتی تھی۔

پٹھانوں کے بعد مغل آئے ان کی زبان ترکی تھی مگر تحریری زبان فارسی

ہی رہی۔ مغل بھی تحریر اور گفتگو کے لئے فارسی ہی بولتے اور استعمال کرتے رہے۔

مسلمانوں کے سبھی خاندانوں کی حکومت کے ساتھ ساتھ۔ شاہی دربار کے برابر ہی گدائی دربار بھی ہوتے تھے۔ اگر بادشاہوں نے اونچے اونچے محلوں اور قلعوں میں اپنے دربار جمائے تو فقیروں اور بزرگان دین نے بھی کسی سنسان مقام کو اپنے دربار کے لئے منتخب کیا۔ لیکن جہاں شاہی درباروں میں سرکاری اور شاہی زبان بولی جاتی تھی۔ وہاں فقیروں کے دربار میں عوام کی زبان استعمال ہوتی تھی۔ یہ زبان فقیر اور ان کے درباری دونوں سمجھتے تھے۔

یہی فقیروں کے دربار کی زبان ابتدائی شکل میں اردو ہے۔ اس میں تحریر نہیں تھی لیکن بول چال کی زبان یہی ہو گئی تھی۔ مقامی الفاظ اور بناوٹ کو قائم رکھتے ہوئے عربی۔ فارسی اور پشتو کے بے شمار الفاظ اس زبان میں شامل ہوتے رہے اور مقامی بولیاں الفاظ کی نئی چمک دمک سے جگمگانے لگیں۔

امتیاز علی خان عرشی رامپوری نے اردو زبان میں پشتو الفاظ اور ضرب الامثال کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے۔ انھوں نے تفصیل سے ان الفاظ کا ذکر کیا ہے جو پشتو سے اردو میں داخل ہوئے۔ یہ عمل براہ راست بھی ہوا اور واسطے سے بھی۔ یعنی پشتو کے الفاظ اردو بن گئے اور سنسکرت۔ فارسی ترکی اور عربی کے بہت سے الفاظ پہلے پشتو بنے اور پھر اردو میں ضم ہو گئے۔

اردو زبان پر پشتو کے اثر کو نظر انداز کر کے علمائے لسانیات نے بیچ کی ایک اہم کڑی کو چھوڑ دیا ہے۔ وہ اردو کو براہ راست شاہ جہاں کی اردوئے معلےٰ سے جوڑ کر زبان کی ارتقائی ترقی کے اصول کو فراموش کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شاہ جہاں کی اردوئے معلےٰ میں یک بیک ایک ایسی زبان پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ جس نے تھوڑے ہی عرصے میں ادبی اور علمی زبان کی حیثیت اختیار کر لی۔

میں اردو کے سلسلۂ نسب کی دوسری زبانوں میں پشتو فارسی ترکی اور عربی کو بنیاد مانتا ہوں۔ اردو ناقدین کے اصول عام طور پر ایک غیر متعلق زبان انگریزی سے لئے گئے ہیں، اس میں فکری کوتاہی اور کچھ احساس کمتری کو دخل ہے، انگریزی ادب اور تنقید سے مرعوب ہو کر یا اس کا ذکر کر کے اردو قارئین کو مرعوب کرنے کے لئے زبان کے فطری عمل اور اس عمل میں دوسری ملکی اور ایشیائی زبانوں کے حصے کو نظر انداز کر کے تنقید کے ایک ضروری گوشے کو نظر انداز کر دیا ہے۔

اردو کی امدادی زبانوں کے تنقیدی اصولوں کے بارے میں ایک سرسری خاکہ پیش کر کے چاہتا ہوں کہ جن لوگوں کا موضوع تنقید ہے۔ وہ زیادہ تحقیق کے ساتھ پشتو۔ فارسی، ترکی اور عربی کے تنقیدی اصول فراہم کریں۔

"پشتو میں تنقید"

پشتو نے اُردو زبان سے پہلے ہی تحریری زبان کی شکل اختیار کر لی تھی۔ زبان قدیم ہے لیکن لمبے عرصے تک صرف بول چال کی زبان رہی بدھ مت کے زوال کے بعد جب اسلام افغانستان میں داخل ہوا تو مذہبی کتابیں لکھنے کیلئے پٹھانوں نے پشتو رسم الخط ایجاد کیا اور مذہبی کتابیں بھی لکھیں۔

خوشحال خان پشتو زبان کا شاعر اعظم ہے۔ اس کی شاعری کو دنیا کی کسی زبان کی بلند اور عظیم شاعری کے مقابلے پر پیش کیا جا سکتا ہے اردو میں صرف اقبال اور جوش ملیح آبادی اس کے قریب ہیں وہ شاعر بھی تھا اور سپہ سالار بھی۔ زندگی بھر اورنگ زیب سے برسرِ پیکار رہا اور پٹھانوں کو اپنی نظموں کی آگ سے گرم کرتا رہا۔

اس نے ادب۔ علم اور شاعری کے بارے میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے یہ تنقید بہت ہی سادہ اور صاف ہے، اس نے علم کی تعریف میں لکھا ہے۔

-"علم ایک معشوقہ ہے۔اس معشوقہ کے لئے اس کا سا عاشق بھی چاہئے۔اگر وہ کسی کم ذات سے بیاہ دی گئی تو اس میں بڑی بڑی خرابیاں ہیں"

-"اگر شعر ہے تو صرف وہ جسے کوئی دانش مند کہے۔وہ کوئی اچھا شعر نہیں جسے کوئی بے ہنر آدمی بنائے -اور دونوں اشعار میں فرق کیا ہوا؟ میں تجھے بتاؤں ؟ایک تو ہوا شہنائی کی آواز اور دوسرا- گدھے کی آواز-"

ادیب کی محنت اور اس کے فن کی بابت لکھتا ہے۔

"خیالات کو جوڑ کر جملے بنانے والا (ادیب) اپنے جگر کا خون کرتا ہے خون۔

-اور پھر جملوں کو آپس میں جوڑنے والا گویا خون جگر کے مزے لیتا ہے۔

-یا اس کی مثال ایک جلاہے کی ہے جو اپنے کپڑے سے بخوبی واقف ہے۔

-سارے تار اس کے شمار کیے ہوئے ہیں کمی یا زیادتی دونوں اس کے لئے عار ہیں۔

-اب اگر ان میں ایک تار بھی کم یا زیادہ ہو جائے تو اس کا بننا اس کیلئے مصیبت ہوتا ہے۔

-کوئی دیبا تو کوئی کمخواب بنتا ہے۔کوئی کمبل اور کوئی کھادی بنتا۔

-بنتے وقت وہ دماغ سوزی سے کام لیتا ہے اور اس میں زردوزی کی دھاریاں ڈالتا ہے۔

-جیسے ململ بنانے کیلئے تانا تانتے ہیں۔ویسے ہی مخمل پر کشیدہ کاڑھتے ہیں۔

-جب میں نے اپنی رائے ظاہر کرنا چاہی تو اتنا کام کر کے تمہیں بتایا۔

اب اگر کوئی دوسرا اس سے بھی اچھا لکھے تو خدا کرے اس کی موت کبھی نہ واقع ہو۔ وہ ہمیشہ زندہ رہے۔

-بہر حال زیادہ تھی یا کم۔وہ بات ختم ہو گئی۔والسلام۔"

خوشحال خان نے اپنے دور کے ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں بھی تنقید کی ہے۔ وہ پیشاور کے قریب سرائے اکوڑہ میں رہتے تھے۔ اس نظم میں اس کا بھی نام لیا ہے۔

''آج اس دور میں بہت ہیں جو شاعری کا دعویٰ کرتے ہیں، خدا نہ کرے جو میں ان کا غلط سلط ذکر کروں۔

-ان میں کوئی پاؤ بھر ہے اور کوئی آدھ پاؤ۔ قلندر ان میں آدھ سیر ہے۔

-واصل کو میں بھولا نہیں۔ وہ میرے حسابمیں ہے۔

-ان کے علاوہ دولت اور فقیر تین پاؤ ہیں۔

-میں ان سے چند سیر شاہی زیادہ ہوں۔ ممکن ہے سرائے اکوڑہ میں ایک ہزار سال بعد کوئی پورا ایک سیر پیدا ہو جائے''

۱۶۶۲ء میں خوشحال خان خٹک ساٹھ سال کا ہو گیا تھا، اس نے ساٹھ سال کی عمر کو شاعری میں پختہ کاری کی عمر قرار دیا ہے۔ وہ شاعری اور تنقید کے بارے میں لکھتا ہے۔

''بیس سال کی عمر میں میری شاعری کی دیگ چولہے پر چڑھائی گئی تھی۔ اب کہ میری عمر کے ساٹھ سال گزر چکے ہیں۔ تب کہیں جا کے وہ پکی ہے۔

-حاسد اگر جل کر میرے اشعار میں عیب نکالے تو میں نے اسے وہی بخشا جو اس نے شعر سے نکالا ہے۔

-شعر کہنے کا اگر کوئی مقصد ہے تو وہ اس قدر ہے کہ اس بہانے ناز و انداز والوں کو یاد کر لیا جائے۔

-کالے غلاف (تحریر) میں ڈھکے ہوئے رنگین معنی کو دیکھو نیاریوں نے ہمیشہ میرا سونا کالی ریت (تحریر) ہی سے نکالا ہے''

اس نظم میں تین اصول بیان کیے گئے ہیں۔ اول شاعر کے پختہ ہونے کی عمر ساٹھ سال ہے۔

دوم۔ تنقید کرنے والے کو حسد کے ساتھ تنقید نہ کرنا چاہئے،

سوم۔ شعر کہنے کا مقصد یہ ہے کہ نازو انداز والوں کو یاد کیا جائے لیکن خوشحال خان نے اشعار کا صرف یہی مقصد نہیں مانا ہے کہ نازو انداز والوں کو یاد کیا جائے۔ اس نے اشعار سے تلوار کا بھی کام لیا ہے۔ اور نصیحت کا بھی۔

اشعار کے بارے میں دوسری جگہ لکھتا ہے۔

-اگر غور سے دیکھو تو شعر کہنا بذات خود کچھ برا نہیں ہے۔ برا یہ ہے کہ کوئی شخص اشعار میں بری اور ناپسندیدہ بات کہے"

خوشحال خان شاعری میں کچھ چیزوں کو ضروری سمجھتا ہے۔

"جب کسی نے بے میزان اور بے عروض شعر کہے تو وہ کوئی شاعری نہیں بلکہ ایسا ہے جیسے کتے بھونک رہے ہیں"

-بحر، مضمون، نازک خیالی، اور تشبیہ، غرض ہر لحاظ سے میں نے پشتو شاعری کو خالص فارسی شاعری کے مرتبے تک پہونچادیا۔

-پشتو زبان ایک تو مشکل ہے دوسرے اس میں بحر نہیں ملتی مجھے بھی یہ بحریں بڑی مشکل سے ہاتھ آئی ہیں۔"

اس سلسلے میں اس نے اپنے دور کے ادیبوں پر تنقید بھی کی ہے

"میں نے کسی اور کے کلام میں ابھی تک میزان نہیں دیکھی۔ حالانکہ مرزا نے پشتو میں بڑے جچے تلے اشعار کہے ہیں۔

-اور آخون کی مخزن تو میں ساری دیکھ گیا۔ اس میں نہ تو مجھے کہیں

عروض ملانہ بحر۔

-لیکن یہ موتی خوشحال خٹک نے بیان کے دھاگے میں پروئے ہیں سمجھنے والے ہی انھیں سمجھیں گے ناسمجھوں کوان سے کوئی غرض نہیں۔"

خوشحال خان زبان کے ارتقائی عمل کا ماننے والا تھا۔اس نے اس سلسلے میں لکھا ہے۔

"اگر کوئی کہے کہ یہ اشعار جو خوشحال خان نے پشتو میں کہے ہیں ایسے نہ اب کوئی کہہ سکتا ہے اور نہ پہلے کسی نے کہے۔ تو وہ بڑا جھوٹا ہے۔"

یہ خود تنقیدی کی ایک مثال ہے۔ اردو ادیبوں اور شاعروں کو خوشحال خان کی طرح خود تنقیدی سے بھی کام لینا چاہئے ۔

خوشحال خان خٹک جب شاعری کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے تو چیخ اٹھتا ہے۔"دنیا میں شاعری سے بری کوئی چیز نہیں، خدا اس جنجال میں کسی کو نہ ڈالے۔"

وہ اس موضوع پر ایک طویل نظم میں اظہار خیال کرتا ہے جو مختصر کر کے پیش کر رہا ہوں۔

-میں شعر و شاعری کے کام سے قطعاً خوش نہیں ہوں۔ مگر کیا کیا جائے کہ خدا نے یہ شاعری میرے گلے منڈھ دی ہے۔

-اشعار سوچنے یا کہنے سننے سے نہیں بنتے۔یہ تو اچانک ساون کے بادلوں کی طرح برسنے لگتے ہیں۔

-شاعری میں صرف سوچتے ہی رہنے سے کلیجہ منہ کو آجاتا ہے یہ مشغلہ کسی دشمن کو بھی نصیب نہ ہو۔

-ایک تو سب سے شاعر کا دل پھر جاتا ہے۔ دوسرے ہر وقت سوچ بچار کے عذاب میں مبتلا رہتا ہے تیسرے کسی کی نامناسب بات برداشت نہیں کر سکتا۔ چوتھے ہر شخص کی عادت اسے ناپسند ہوتی ہے۔

-پانچویں یہ کہ کوئی دوسرا شاعر کیسے ہی ہیرے موتی اشعار میں پروئے۔ یہ اس میں کوئی نہ کوئی عیب ضرور نکالے گا۔

-پھر یہ کہ ہر شاعر تمہارے کلام میں غلطیاں ضرور نکالیگا چاہے تم کمال میں من بھر ہو اور وہ صرف ایک شمہ۔

-اس کے علاوہ اشعار میں اس قدر جھوٹ بولا جاتا ہے کہ جلد ہی خود شاعر بھی دروغ گو بن جاتا ہے۔

-مثلاً وہ محبوبہ کے چہرے کو گل لالہ سے تشبیہ دے گا بھلا لالہ کو محبوبہ کے چہرے سے کیا نسبت؟

-اور ہرنی کی ناف کے مردار خون کو محبوب کے خال کا ہم پلہ بنا دیگا۔

-یا قد یار کو سرو کے درخت کا ہمسر ثابت کرے گا حالانکہ سرو تو باغ کا فقط ایک درخت ہے۔

-اسی طرح غزل میں معشوقہ کی سیاہ غمزہ کرنے والی آنکھوں کو ہرنی کی آنکھوں سے تشبیہ دے گا۔

-بس اس طرح وہ سرسام کے مریض کی طرح واہی تواہی بکا کرتا ہے یا خاموش ہوتا ہے تو دل ہی دل میں سوال وجواب کرتا رہتا ہے۔

-لوگ آرام سے سوئے ہوئے ہیں اور یہ جاگ رہا ہے اس کا پلنگ پر سونا بہت مشکل ہوتا ہے۔

-یا کسی اچھے مضمون کیلئے ایک لفظ کی تلاش میں سویرے تک کروٹیں

بدلتا رہتا ہے۔

-محفل میں بیٹھے بیٹھے کوئی خیال آ گیا تو اور سب تو ہنستے بولتے ہیں اور یہ غمگین بیٹھا رہتا ہے۔

-اگر نماز میں کوئی شعر موزوں ہو کر آ گیا تو آعوذ کے ذال کو بے خیالی میں دال سے بدل دیتا ہے۔

-اسے دنیوی مال وزر کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ آؤ دیکھو یہ شاعری ہی اس کا مال ہے اور یہی متاع عزیز۔

-سمر قند و بخارا کیا ہے؟ میں تو وہ ہوں کہ حسین چہرے کے ایک خال پر سارا جہاں بخشتا ہوں۔

-سچ کہوں۔ جب میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ شاعری بادشاہوں کا کام ہے یا مسخروں کا۔

-ہیرے موتی یا تو طوائفوں کے پاس ہوتے ہیں یا شہزادیوں کے پاس اسی طرح اچھا لباس کسی بادشاہ کا ہوتا ہے یا کسی کمینے اترانے والے کا۔ انھیں سے یہ لوگ یاد کئے جاتے ہیں۔

-پھر اشعار کی وجہ سے جو لوگ یاد کئے جاتے ہیں ان کے پاس یا تو حسن و کمال ہوتا ہے یا وہ علم کے خسرو ہوتے ہیں۔

-جو کوئی مناسب طریقے پر شاعری کو کام میں لائے تو اس کا علم زیادہ ہوتا ہے اور حکمت و دانائی بڑھتی ہے۔"

اس رواں نظم میں وہ اشعار کی ترتیب کے اصول بتاتا ہے ایک صناع اور کاریگر کی طرح شاعر کا بھی یہ کام ہے کہ وہ اپنے اشعار کو علم و ادب کے موتیوں

سے آراستہ کرے۔ کہتا ہے۔

"خیالات کے تانے میں بانا ڈالا جاتا ہے۔ پھر کوئی اشعار کی شال بنتا ہے اور کوئی اطلس۔

-ہر بحر میں سب حروف گنتی کے ہوتے ہیں اور تقطیع کے مطابق حصوں کو جوڑا جاتا ہے۔

-صنعت کی خوبصورت ٹکلیاں لگائی جاتی ہیں یہی حال تجنیس۔ ترصیع اور اشکال کا ہوتا ہے۔

-عروض میں وہ موشگافیاں کرتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے بس یوں سمجھو کہ الفاظ کی ایک مثالی دلہن لا بٹھاتے ہیں۔

-ہر شعر موزوں کرتے وقت شاعر کے دل میں ایسا درد اٹھتا ہے جیسے عورت کے دردزہ۔

-شاعر کے اشعار بالکل پانی کی صفت رکھتے ہیں کھاری اور کڑوا پانی بھی۔ میٹھا اور شفاف پانی بھی۔

-شعر کہنا ہر فاسق و فاجر کا کام نہیں اور نہ ہر مفلس اور بھو کی آنکھوں والے کا۔

-شاعری تو سالک کا کام ہے یا آفاق کا۔ عاشق کا۔ دکھیارے کا یا ایک کامل ولی کا۔

-جو اشعار کے موتی مال کے عیوض بیچے خدا کرے اس کی زبان میں پھوڑا نکل آئے"

خوشحال خان نے اس نظم میں اشعار سے اچھے اور برے کام لینے کی طرف

اشارہ کیا ہے۔ لیکن اس کا نظریہ یہ ہے کہ شاعری کو اچھے کاموں کیلئے استعمال کرنا چاہیے۔ وہ پورے علم کے لئے بھی یہی نظریہ رکھتا ہے کہ علم اور شاعری کو با مقصد ہونا چاہئے۔ اس کے خیال میں علم سوسائٹی کے لئے اژدہا بھی ہے اور عصائے موسوی بھی۔ اس نے لکھا۔

-علم کے حصول کی کوشش کرو۔ مگر علم اژدہا بھی ہے اور عصا بھی یا تو علم میں لذت ہے یا مولا کے عشق میں باقی سب کام فضول ہیں۔ چاہے اعلیٰ ہوں یا ادنیٰ"

خوشحال خان نے اشعار اور شاعری کو ہر شخص کا مشغلہ ماننے سے انکا کیا ہے وہ شاعری کے لئے ایک سحر کار کی ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے لکھا ہے۔

"جیسے شیر کے لئے ایک تیر انداز کی ضرورت ہوتی ہے ویسے ہی اشعار کے لئے ایک سحر کار درکار ہوتا ہے۔

-دل کے ہاتھ میں ہمیشہ اوزان کی میزان ہوتی ہے جو ایک حرف کی کمی بیشی بھی بتادیتی ہے۔

-کالے گھوڑے پر حقیقت کی دلہن کو سوار کرتے ہیں جس نے اپنے گورے چہرے پر مجاز کا نقاب ڈال رکھا ہے۔

-سو جلوے سو انداز اور سو غمزے۔ نگاہوں میں ادائیں جھلکتی ہوئی صنعت کے کئی قسم کے زیور پہنے ہوئے۔ توصیع کا لمبا چوڑا ہار گلے میں ڈالے مضامین کی نزاکت کے غمزے لئے ہوئے سر سے پاؤں تک تمام جسم سڈول ۔

-اگر نظم میں کوے اور گدھ کا ذکر کروگے تو وہ بھی یوں کہ جیسے باز دِلوں کے شکار کی تاک میں پھرتا ہے۔

-جب بات کہنا ہو تو دانا وہ ہے جو اختصار کے ساتھ بات کہے جب

خوشحال نے پشتو میں اشعار کہنا شروع کئے تو اس میں بڑی بڑی خوبیاں پیدا کردیں،،

خوشحال خان کو اپنی شاعری پر بڑا ناز تھا لیکن وہ ہمیشہ تنقید نگاروں کو دعوت دیتا رہتا تھا کہ اس کے ادب کو پرکھنے کی کوشش کریں ایک قطعہ میں وہ کہتا ہے

"یہ گہرے معنی کے اشعار ہیں سیدھی سادی باتیں کب ہیں کوئی اشعار کہنے کے لئے منہ کھولتا ہے تو گویا اس سے شکر ٹپکتی ہے۔

کوئی کچھ کہنے پر آتا ہے تو اس کی سب باتیں خاک دھول ہوتی ہیں۔

کیا کانچ کی موت کے موتی بازار میں ضائع نہیں جاتے۔

چھاج بیچتے ہوئے گوجریاں اپنی اپنی چھاج کی تعریف کرتی ہیں (مگر پرکھنے والوں) ہر ہر جوڑ کو غور سے دیکھو زرہ بڑی ہنرمندی سے بنائی جاتی ہے۔

-بڑی اچھی باتیں کہ گئے خوشحال۔ بس کرو بہت آگے مت جاؤ۔"

اپنی عظمت شاعرانہ کا اظہار اس شاعر نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

میں وہ ہوں کہ جب قلم ہاتھ میں لیتا ہوں تو عطارد (قسمتیں لکھنے والا استارہ) مجھے دیکھنے لگتا ہے کہ اب صحیفے پر کیا لکھنے والا ہوں۔

- محض قیاس سے میرا اندازہ مت لگاؤ اگر مجھے غور سے دیکھو گے تو میں ظاہر میں شہباز کے مانند ہوں اور باطن میں مثل خورشید۔

-اگر میں بلندی و پستی کا دعویٰ رکھتا ہوں تو یقین جانو کہ میں مٹی سے زیادہ پست ہوں اور آسمان سے زیادہ بلند۔

-خوشحال خان یہ تم کس سے کہہ رہے ہو کہ "میرا کلام سونا ہے"
کیونکہ اندھوں کے لئے جیسا سونا ویسا رانگا۔"

ساڑھے تین سو سال پہلے پشتو کے شاعر نے شاعری اور ادب کے بارے میں جو باتیں لکھی ہیں وہ موجودہ اردو تنقید کے اصولوں میں کام نہیں آسکتیں کیا خوشحال کے ذہن ومزاج سے اردو شاعری اورادب کو آگے بڑھنے اور زندگی کی بلندیوں کاذکر کرنے کاحوصلہ نہیں ملتا۔

اگر غالبؔ، اقبالؔ اور جوشؔ اپنی اردو شاعری میں خوشحال خان سے اثر قبول کر سکتے ہیں تو اردو تنقید نگاروں کے لئے بھی خوشحال خان سے تنقیدی سبق لیناذلت کی بات نہیں ہے۔

ممکن ہے ایلیٹ ڈکنس اور افلاطون کانام لینے سے نئی نسل مرعوب ہو جاتی ہولیکن وہ بلند اور علمی نظریات جو خوشحال خان سے مل سکتے ہیں اردو کے لئے یورپ کے کسی شاعر اور ناقد سے نہیں مل سکتے۔

”عربی میں تنقید“

اردو زبان کو عربی سے بھی بہت کچھ ملا۔ الفاظ، جملے، ضرب الامثال اور انداز بیان مناسب ہوگا کہ عربی میں تنقید کی بنیادوں کے بارے میں کچھ گفتگو کر لی جائے۔

جب سرزمین عرب سے آفتاب اسلام طلوع ہوا اور جب حبیب خدا حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ نے اللہ کا کلام پیش کیا تو عرب کے سب سے متمدن اور پڑھے لکھے شہر۔ مکہ میں سترہ اٹھارہ آدمی تھے جو عربی میں لکھنے پڑھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عرب علم سے بیگانہ تھے یا شاعری اور ادب سے ناواقف تھے۔ قرآن سے پہلے جو کچھ تھا سب یادداشت میں تھا طویل نظمیں سیکڑوں آدمیوں کو یاد تھیں، داستانیں اور افسانے برزبان تھے۔ اپنے قبائل کے

بارے میں اچھا یا برا کوئی شعر عربوں کے کانوں میں پڑ جائے، حفظ ہو جاتا تھا۔

زمانۂ جاہلیت میں عرب میں نجران کا پادری قس بن ساعدہ اپنی قادر الکلامی، سحر طرازی، شعلہ بیانی، فصاحت و بلاغت اور زباندانی کی وجہ سے بڑا اہم شمار ہے، جمعہ کے خطبوں اور عربی تقاریر میں "امابعد" کہنے کا رواج قسؔ ہی نے ڈالا تھا۔ قسؔ کا تعلق قبیلہ ایاد سے تھا۔ اس زمانے کا وہ پہلا شخص ہے جس نے نعرۂ توحید بلند کیا اور بت پرستی چھوڑ کر ایک خالق کی اطاعت کرنے پر زور دیا،

جاحؔظ کا بیان ہے کہ ۔"قبیلہ ایاد اور تمیم کے لوگوں کو تقریر میں ایسی امتیازی شان حاصل تھی کہ جو اور کسی کو نہیں اور خاص طور سے قس کو اس فن میں جو مہارت اور دسترس حاصل تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ خود آنحضرت ﷺ نے نہ صرف عکاظ کے میلے میں قسؔ کے ٹمیالے رنگ کے اونٹ پر بیٹھ کر تقریر کرنے کا نقشہ کھینچا ہے بلکہ آپ نے قریش اور عربوں سے اپنی زبان مبارک سے اس کی تقریر کی بھی روایت کی ہے آپ ﷺ اس کے بولنے کے دلکش انداز سے بھی اتنا متاثر تھے کہ دل کھول کر اس کی داد دیتے تھے۔" قسؔ شاعر بھی تھا اُس نے اپنے دو بھائیوں کی قبر پر کھڑے ہو کر ایک پُرسوز مرثیہ کہا ہے۔

ترجمہ :- اے میرے دونوں پیارو، اب اٹھ بھی جاؤ تمہیں سوئے ہوئے بڑی دیر ہو گئی مجھے تو کچھ ایسا لگتا ہے کہ تم کبھی بھی اپنی نیند پوری نہیں کرپاؤ گے۔

-کیا تمہیں یہ نہیں معلوم کہ سمعان میں، میں اکیلا رہ گیا ہوں اور تم دونوں کے سوا اب وہاں میرا کوئی ساتھی نہیں۔

-اب میں تم دونوں کی قبروں ہی پر رہ جاؤں گا۔ اور پوری راتیں یہیں بتادوں گا یا تم دونوں کی (صدا) روح میری باتوں کا جواب دے،

-موت تمہاری رگ وپے میں اس طرح سرایت کر گئی ہے کہ جیسے اعقار (ایک قسم کی شراب) پلانے والے نے تمہیں بھی یہ شراب پلادی ہے۔
-اگر کوئی جان کسی جان کے بچانے کے لئے دی جاسکتی تو بلا تکلف میں اپنی جان تم پر قربان کر دیتا"

عمر کے آخری حصے میں قس نے ترکِ دنیا کر کے عبادت وریاضت میں سادہ زندگی گزاری اور بعثت سے قبل ۶۰۰ء میں انتقال فرمایا۔

قبیلہ زبید کے فرد عمرو بن معدی کرب، معروف گھوڑ سوار وجیہ اور خوش خور انسان تھے۔ تلوار اور زبان کے دھنی تھے مقررین کی سفِ اول اور شعراء کی دوسری صف میں شمار کئے جاتے تھے چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی دلکش تقریر فرماتے تھے۔ تقریر میں اگر کہیں سجع آجاتا تو اسے استعمال کر کے تقریر کو رنگین بنا دیتے۔ مشکل الفاظ کا استعمال کرتے تھے۔ اشعار میں اپنی بہادری اور شجاعت پر فخر کرتے تھے۔ شاعری میں انداز بیان دلکش۔ خوبصورت اور غریب وثقیل الفاظ سے پاک ہے۔

۹ھ ہجری میں جب آنحضرت ﷺ غزوۂ تبوک سے واپس آرہے تھے تو عمرو نے ان سے ملاقات کی اور اسلام لے آیا لیکن زندگی چونکہ دوسرے ہی ڈھب سے گزری تھی اس لئے اسلام چھوڑ کر دوبارہ مرتد ہو گیا لیکن جلد ہی پھر اسلام قبول کر لیا اور کئی اسلامی جنگوں میں شریک رہا۔ اسلام کی مشہور جنگ قادسیہ میں بھی شریک تھا اور اس وقت اسکی عمر ۱۱۰ سال تھی۔

ان کے علاوہ زہیر بن خباب الکلبی، ذوالاصبع العدوانی اور دوسرے بہت سے مقررین، شعراء اور نثر نگاروں نے عربی زبان میں شاعری مرثیہ ضرب الامثال اور کہاوتوں کو جنم دیا اور نثر سجع ومرسل کو ایجاد کیا۔ مرسل۔ نثر کی وہ قسم ہے جس

میں عبارت کے آخری کلمات میں قافیہ بندی نہ ہو یعنی ہر جملے کا آخری لفظ ایک وزن پر نہ ختم ہوتا ہو۔ جبکہ ہر جملے یا دو جملوں یا ان سے زیادہ جملوں کے بعد کے الفاظ میں قافیہ بندی یعنی ہم وزن الفاظ استعمال کئے جائیں تو یہ سجع کہلائیگا۔

زمانۂ جاہلیت کے عربی ادب میں لوک کتھاؤں، تاریخی کہانیوں ایام العرب کی کہانیوں اور حسن وعشق پر مبنی واقعات کی بھی بڑی اہمیت ہے عام طور پر ان کہانیوں کے بیان میں عربی ادیبوں نے جو نثر استعمال کی ہے۔ وہ روزمرہ کی زبان ہے جس میں مترادفات کا استعمال قطعی نہیں ہے جملے عام طور پر چھوٹے یا درمیانی ہوتے تھے اور حکمت وفلسفہ کہاوتوں اور وصیتوں میں استعمال ہوتے تھے اور اختصار پسندی کو خاص مقام حاصل تھا۔

عہد جاہلیت کے نثر نگاروں میں لقیط بن العمیر الایادی، عدی بن زید العابدی اور اس کا بیٹا قابل ذکر ہیں ان کے بارے میں ہم تک جو اطلاعات پہونچی ہیں ان کے مطابق یہ نثر نگار کسریٰ اور نوشیرواں کے دربار کے محرر اور مترجم تھے۔

شاعری کو عربوں نے "ادب عالیہ" کہا ہے جس میں نقاشی موسیقی اور پینٹنگ بھی شامل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ "موزوں ومقفع کلام شعر ہے" اور شعر کی یوں تعریف کی ہے۔ -شعر وہ فصیح وبلیغ کلام ہے جس میں وزن کے علاوہ نادر اور اچھوتے خیالات اور لطیف جذبات واحساسات کی عکاسی اس طرح کی گئی ہو کہ انسان کے دل ودماغ پر براہ راست اس کا اثر پڑے"

عربی ناقدین کا خیال ہے کہ شعر کی اولین شکل "رجز" ہے رجز کے بارے میں یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ - مضر بن نزار ایک مرتبہ اپنے اونٹ پر سے گر گیا اور اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ لوگ جب اسے اٹھا کر لے چلے تو شدت

تکلیف سے اس نے چلاکر کہنا شروع کیا۔"وایداہ وایدہ یعنی ہائے میرا ہاتھ ہائے میرا ہاتھ ۔ آدمی خوش گو تھا چنانچہ جب اس کی زبان سے ایک خاص زیر و بم اور خاص وقفے سے یہ الفاظ نکلنے لگے جس میں تکلیف اور درد کیوجہ سے سوز بھی پیدا ہو گیا تھا تو اونٹوں نے انھیں غور سے سنا اور آواز کے پیچھے تیز چلنے لگے۔اس سے عربوں کو پہلی مرتبہ یہ اندازہ ہوا کہ اگر اس طرح کی آواز اس انداز سے نکالی جائے تو اونٹ تیز چلنے لگتے ہیں چنانچہ انھوں نے مضر کے جملے کے مطابق۔"ہایدا -ہایدا" کی آواز منہ سے نکالی اور محسوس کیا کہ اونٹوں پر اچھا اثر ہوتا ہے۔اس لئے اس کا رواج پڑ گیا اور اس طرح آواز پیدا کر کے اونٹوں کو تیز چلانے کے لئے "حدی خوانی" کی اصطلاح بنی جو دراصل گانے کی ایک شکل تھی اور اس گانے کو رجز کہتے، رجز کے لفظی معنی ہیں۔"اونٹ کا چلنا اور اس کا ہلنا"

عربوں میں شاعر کو بڑی عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور جب کسی کے یہاں لڑکا پیدا ہوتا، اصیل گھوڑی بچہ دیتی یا شاعر پیدا ہو جاتا تھا تو اسے مبارک باد پیش کی جاتی تھی۔چنانچہ معروف عربی شاعر اعشیٰ کے بارے میں مشہور ہے کہ جب اس نے رسولِ خدا ﷺ کے پاس آکر آپ ﷺ کی شان اقدس میں مدحیہ قصیدہ پڑھنا چاہا تو ابو سفیان نے قریش کے ممتاز افراد کو جمع کر کے کہا۔خدا کی قسم اگر یہ محمد ﷺ کے پاس چلا گیا اور آپ کی پیروی کر لی تو اپنے اشعار کے ذریعہ سارے عرب کی آگ تمہارے خلاف بھڑکا دے گا۔اس لئے اس کے لئے سو اونٹ جمع کرو۔ چنانچہ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا اور اعشیٰ نے وہ اونٹ لے لئے اور اپنے شہر کو واپس چلا گیا"

اسی طرح قبیلہ، کلاب کے ایک شخص محلق کی سات بیٹیوں کی شادیاں غریبی کی وجہ سے نہیں ہو رہی تھیں۔اتفاق سے انھیں دنوں اعشیٰ مکہ جاتے ہوئے

ادھر سے گزرا تو محلق کا مہمان ہوا جس نے ایک اونٹنی ذبح کر کے اعشیٰ کی بڑی خاطر مدارات کی اور جب اعشیٰ پر نشہ چڑھنے لگا تو اس نے محلق کے بال بچوں کے بارے میں دریافت کیا۔ محلق نے اپنی بپتا سنادی' اعشیٰ کے دل پر اس کا بڑا اثر ہوا اور اس نے عکاظ کے میلے میں محلق کی شان میں ایک قصیدہ پڑھا۔ اس قصیدے کے اثر سے عرب، کے شرفاء ورؤساء نے محلق کی بیٹیوں سے عقد کر لیا۔

ایک شاعر امرالقیس نے اپنی محبوبہ کا سراپا اس طرح بیان کیا ہے۔

ترجمہ:- میری محبوبہ گوری چٹی اور پتلی کمر والی ہے۔ اس کا پیٹ ڈھلکا ہوا نہیں ہے، اس کا سینہ آیئنے کی طرح چکنا اور شفاف ہے۔

-اور میری محبوبہ کی گندھی ہوئی چوٹی کے بال اتنے کالے اور گھنیرے ہیں کہ پشت کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں اور اتنے گھنے ہیں کہ جیسے خوشوں سے لدی ہوئی کھجور کے درخت کا خوشہ ہوں۔

-اور اس کی کمر اتنی پتلی اور لچک دار ہے جیسے کہ اونٹنی کی مہار ہو اور اس کی پنڈلی ایسی صاف ستھری کہ جیسے سرسبز وشاداب بردی کا پودہ ہے جو بہت زیادہ سینچائی کی وجہ سے اتنا نرم و نازک ہو گیا ہے کہ جھکا پڑتا ہے۔

دوسرا شاعر زہیر بن ابی سلمیٰ اس طرح حکمت وفلسفہ بیان کرتا ہے۔

ترجمہ:- اور جو شخص اکثر معاملات میں نرمی اور مدارات سے کام نہیں لیتا وہ دانتوں سے کاٹ لیا جاتا ہے اور پاؤں سے روندیا جاتا ہے۔

-اور جو شخص اپنی ضرورت سے زیادہ مال ودولت ہونے کے باوجود اپنی قوم کے ساتھ بخل کرتا ہے تو اس سے بے پروائی برتی جاتی ہے اور اس کی برائی کی جاتی ہے

-اور جو شخص اسباب موت سے ڈرا تو پھر موت اس کو پالیتی ہے چاہے

وہ زینہ لگا کر آسمان کے کناروں پر کیوں نہ چڑھ جائے۔
تیسرا شاعر طرفہ بن العبید کہتا ہے۔
ترجمہ:- ہر دوست جس سے میں نے دوستی کی خدا نے اس کے دانت نہ چھوڑے یعنی جس سے بھی میں نے دوستی کی اس نے خندہ پیشانی اور ہنسی خوشی سے نہیں نباہا۔ سب کے سب لومڑی سے بھی زیادہ چال باز تھے آج کی رات کل کی رات سے کتنی مشابہ ہے۔

اس کے علاوہ عربوں کے علم کا یہ عالم تھا کہ کعبے کے دروازے پر سات قصیدے لکھے ہوئے لٹکے تھے۔ یہ عربی کے سات ادبی شہ پارے شمار کئے جاتے تھے۔ اسکے علاوہ تنقید اور اصلاح کا رواج بھی تھا۔ عربوں کے عہد جاہلیت کے شاعر اعظم لبید کے بارے میں مشہور ہے کہ لوگ اپنے اشعار کعبے کی دیوار پر لٹکا دیتے تھے۔ لبید سویرے ٹہلنے آتا تھا تو لکھے ہوئے تمام اشعار پر اصلاح دیتا چلا جاتا تھا۔

اللہ کا کلام قرآن تھا۔ اس نے اپنے کو تنقید اور مقابلے کیلئے پیش کیا۔ کہا۔ ”اگر مخالفوں کو اس کلام میں شک ہے کہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے تو اس کی ایسی ایک آیت وہ بھی بنا لائیں“

ظاہر ہے کہ اس اعلان کے بعد مخالفوں نے کوشش ضرور کی ہوگی لیکن کسی نے مقابلے میں آکر قرآن کو چلینج نہیں کیا۔ اس طرح اللہ کا کلام تنقید اور اصلاح سے بالاتر مان لیا گیا۔

اسلام کی اشاعت کے ساتھ علم کی بھی اشاعت ہوئی۔ عربوں نے بڑی تیزی سے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا رسول اللہ ﷺ نے مدینے میں ایک درس گاہ، صفہ قائم کر دی عرب صرف عربی ہی نہیں دوسری زبانیں بھی پڑھنے لگے۔

دیکھتے ہی دیکھتے تعلیم عام ہو گئی، لیکن جنھوں نے اسلام کی تعلیم حاصل کی تھی وہ محبوبہ کے فراق کے گیت کیسے گا سکتے تھے اس لئے قرآن کی ترتیب کے بعد ابتدائی کتابیں، مسائل، فقہ یا احادیث نبویؐ کے بارے میں لکھی گئیں۔

اسلام برق رفتاری کے ساتھ ایران اور شام سے گزر کر ترکستان اور مصر پہونچ گیا۔ اب دوسری قوموں کے اہل علم سے بھی سابقہ پڑا حکومت بہت وسیع ہو گئی۔ پیچیدہ مسائل سے واسطہ پڑا۔ قوانین بھی مسائل کی مناسبت سے بننے لگے اسلام کی عربی سادگی رفتہ رفتہ ختم ہونے لگی۔

خود مسلمانوں میں سیاسی اختلاف نے سر اٹھایا۔ لوگوں نے رسول اللہ کے نام سے احادیث بیان کرنا شروع کردیں۔ جھوٹی حدیث بیان کرنا بھی کوئی جرم نہیں رہا احادیث کی کتابیں قرآن سے زیادہ ضخیم ہو گئیں اور یہ بھی عجیب بات ہوئی کہ ایک ایک مسئلے کے لئے کئی کئی احادیث آ گئیں اور سب ایک دوسری کی ضد۔ مسلمانوں نے قرآن کو سند بنانے کی جگہ احادیث کو سند بنانا شروع کردیا۔

اس دور کا علم یہی تھا۔ اس علم کے ساتھ مذہبی تقدس بھی تھا یہ کہ دینے کے بعد کہ فلاں مسئلے میں رسول اللہ ﷺ کی حدیث یہ ہے۔ کوئی مسلمان اختلاف کی ہمت بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اب اہل علم کے لئے ضروری ہو گیا کہ وہ احادیث کے بارے میں تنقید سے کام لیں۔ اور اس تنقید کے لئے اصول وضع کریں۔ یہ بڑی کاوش اور ہمت کا کام تھا احادیث نبوی کی تصدیق یا تکذیب کرنے کا کام آسان نہیں تھا۔ احادیث کے بیان کرنے کی مدت لگ بھگ ایک سو سال ہو چکی تھی۔ ذہنوں میں احادیث کا بھی تقدس تھا اور احادیث جمع کرنے والوں کا بھی۔

وہ بہت ہی باہمت لوگ تھے جنھوں نے احادیث کی حجت اور عدم حجت

کے بارے میں فیصلے دینے کا کام شروع کیا۔

مسلمانوں کے پاس صرف قرآن کا علم تھا جو تنقید سے بالا تھا۔ جب علم کا ذوق بڑھا تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے اقوال اور ان کی زندگی کے واقعات لکھنا شروع کئے حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس کام میں پہل کی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے گورنر علامہ امام ابو بکر بن حزم نے ان احادیث کو کتابی صورت میں جمع کیا۔حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے انھیں حکم دیا۔ ''جب تک حدیث صحیح نہ ہو لکھی نہ جائے۔ لوگوں کو چاہئے کہ علم کی اشاعت کریں کیونکہ چھپانے سے ختم ہو جاتا ہے۔''

دوسری صدی ہجری میں امام مالکؒ نے اپنی کتاب ''موطا'' مکمل کی یہ احادیث کی مستند اور تحقیقی کتاب تھی۔

۱۹۴ھجری میں امام بخاری پیدا ہوئے اٹھارہ سال کی عمر میں انھوں نے احادیث کی تنقید کا کام شروع کیا اس کام میں بھی لگ بھگ بیس سال لگ گئے۔ انھوں نے حدیث بیان کرنے والوں سے لیکر راویوں کا سلسلہ رسول اللہ ﷺ تک جوڑنے کی انتھک کوشش کی۔صحیح اور غلط کے پرکھنے کے اصول بنائے۔ حدیث کی قسمیں بنائیں، متصل، حسن، منکر، اور معروف میں ان حدیثوں کو تقسیم کیا۔ مسلم، ابوداؤد، نسائی، اور ابن ماجہؒ نے بھی علم حدیث کو بنیاد بنا کر کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع کر دیا۔ حدیث کے ذوق نے سیرت تاریخ اور قصص کے مضامین کی طرف بھی متوجہ کیا۔ مسلم عرب میں ہر طرف علم کا چرچا پھیل گیا۔

اب عرب شعر و شاعری کی طرف بھی متوجہ ہوئے دربارِ رسالتؐ میں بھی حسان بن ثابتؓ کے ایسے شاعر رہے تھے، دوسری صدی ہجری شروع ہوتے

ہی شاعری دینی مضامین کو پھلانگ کر حسن و عشق کی محفلوں میں پھر پہونچ گئی۔
ایک شاعر ذی الدمہ نے اپنی محبوبہ کی تعریف میں یہ شعر کہا۔

"پوراحج اس وقت ہو سکتا ہے جب حاجیوں کی اونٹیاں
خرقاء کے پاس اس وقت ٹھہر جائیں جب وہ اپنے چہرے سے
نقاب ہٹائے ہوئے ہو"

خرقا اس کی محبوبہ کا نام تھا۔ ایک دن وہ اپنا یہ شعر پڑھ رہا تھا اور بہت سے لوگ اس کے گرد جمع تھے۔ شعر کی تعریف ہو رہی تھی۔ اتنے میں اس دور کا ایک اور شاعر جریر ادھر سے گزرا، اس نے ذی الرمہ کے شعر کی تنقید کی۔

- تیرا شعر ہرن کی مینگنیوں کی طرح ہے جس میں یوں ہی سونگھنے سے بو محسوس ہوتی ہے لیکن اگر توڑ کر دیکھا جائے تو کچھ نہیں۔"

جریر نے اپنی تنقید میں اس طرف اشارہ کیا ہے کہ ذی الرمہ کا شعر الفاظ کی بندش کے نقطۂ نظر سے خوب کہا جا سکتا ہے لیکن اگر اس کے مفہوم پر غور کیا جائے تو بالکل لاحاصل اور خلاف عقل شعر نکلے گا۔

عبدالحمید بن یحییٰ نے ادیبوں کیلئے ایک رسالہ تحریر کیا اس میں علم وادب کی رہنمائی کا فرض انجام دیا ہے۔ لکھا ہے۔

"علم کے ہر موضوع کو حاصل کرو اور اسے سختی کے ساتھ یاد رکھو۔ مادری زبان کے جتنے علوم ہیں انہیں حاصل کرو پہلے پروردگار کی پاک کتاب کو پڑھو اور سمجھو پھر اپنی زبان کی اصلاح کرو۔ اشعار عرب کو یاد رکھو ان کے معنی اور لغات کو یاد کرو جس مسئلے میں اپنی عقل اور فکر سے کام نہ لے سکو لازم ہے کہ اس میں زیادہ بحث نہ کرو میانہ روی اختیار کرو نہ بہت کم۔ اختصار سے کام لو جتنا بولو یا لکھو اسکے بارے میں تمام حجتوں اور دلیلوں کو پہلے سے سوچ لو۔ انشاء کا فن

نہایت شریف فن ہے انسان کو اس علم کی بدولت اوروں پر فضیلت حاصل ہے اس لئے تمہیں چاہئے کہ اوروں کے ساتھ بہت ہی نرمی سے پیش آؤ"

اس سمجھ اور غور و فکر نے علم کا دریا بہادیا۔

حضرت علیؓ نے علم نحو کا ایک رسالہ مرتب کر کے ابوالاسود کو دیا کہ اس ڈھنگ پر تحریر لکھا کرو۔

پھر جب عجمی اور شامی اور رومی اسلام میں داخل ہوئے اور اپنی زبانوں کا تلفظ ملا کر عربی تلفظ کو خراب کرنے لگے تو حجاج بن یوسف گورنر کوفہ نے اعراب اور نقطے لگا کر تلفظ کو درست کیا۔

خلیفہ ابو جعفر منصور عباسی کے دیوان عبداللہ نے "علم مناظرہ" کی بنیاد رکھی۔ منشی عبدالحمید بن یحیٰ نے جو مروان بن حکم اُموی کا ایک عہدے دار تھا علم انشاء کو ترتیب دیا۔

خلیفہ ہارون الرشید کے معلم ابو عبیدہ نے لغت لکھنا ایجاد کیا اسی زمانے میں بو علی محمد نے لغت کا متن لکھنے کا رواج ڈالا اس علم سے الفاظ کی اصل کا پتہ چلتا ہے۔

معاذ بن مسلم نے "علم صرف" ایجاد کیا، جس سے الفاظ کے مختلف معانی معلوم ہوتے ہیں۔

خلیفہ ہارون الرشید ہی کے زمانے میں ابو عبدالرحمٰن نے "علم عروض" ایجاد کیا۔

خلیل بن احمد نے "قافیے" کی بنیاد ڈالی۔

خلیفہ معتمد عباسی کے بھائی ابو عباس نے "علم بدیع" ایجاد کیا۔ مقتدر عباسی کے زمانے میں عبدالقادر جرجانی نے ادب کو "معنی و بیان" کا علم دیا۔

ان کے علاوہ علم اشتقاق،علم اصول النحو، شعر گوئی، نثر نویسی، علم فصاحت، اور علم خطابت وغیرہ میں کتابوں کے ڈھیر لگادیے۔

پھر فلسفے کی طرف رجوع ہوئے تو علم کلام،علم تاریخ، علم مناظرہ، فلکیات، علم ستارہ شناسی پر کتنی ہی کتابیں لکھ ڈالیں۔۔

غرض علم صرف ونحو ہو یا معنی وبیان۔علم عروض ہو یا علم قافیہ۔امام بخاریؒ کی صحیح بخاری ہو یا ابوداوٗدؒ کی مسند، علم کلام ہو یا علم مناظرہ سیرت ابن ہشام ہو یا واقدی کی فتوح الشام، سبھی علم وادب کے مختلف پہلوؤں کی تنقیدی بحثوں سے بھرے پڑے ہیں۔

اس مضمون میں ابھی تشنگی باقی ہے۔لیکن اس سے یہ اندازہ ضرور ہو جائے گا کہ اردو ادب کو پرکھنے والے طالب علموں کو جن تنقید نگاروں نے یورپ کی طرف بھیجنے کی روایت بنا رکھی ہے۔انھوں نے اردو کو اس کی دودھ پلانے والی مائیں۔سنسکرت پراکرت زبانیں۔پشتو، ترکی، عربی اور فارسی سے دور رکھا ہے۔ انھیں زبانوں سے علم تنقید کے اصول نکال کر اردو زبان کو نئے علم سے مالا مال کیا جا سکتا ہے۔

ادب اور انسانی زندگی

اگر اس بحث میں الجھا جائے کہ زبان کس طرح وجود میں آئی تو ہرڈرونٹ، رڈالف ایسلر، جی رے ویز، فریڈرک فان شلیگل، میکس فلر اور ایٹن ہل کے علاوہ نہ جانے کتنے مفکرین کے نظریات وخیالات پر مفصل بحث کے باوجود مسئلہ پوری طرح سمجھ میں آنا ممکن نہیں ہے۔اس لئے اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں کہ انسان نے لکھنا پڑھنا کب سے شروع کیا اور یہ بھی مان لینا

درست نہیں کہ تین چار ہزار سال پہلے کا انسان جاہل یا غیر متمدن تھا، دور قدیم کے ماہرین نے یہ بات مان لی ہے کہ زمین پر سب سے پرانا تحریری نسخہ، "کتاب ایوب" ہے جس کی عمر چار ہزار سال سے زیادہ ہے اور جو پکی اینٹوں کی تحریر میں دستیاب ہوا ہے۔

اگر اس تحقیق کو مان لیا جائے تو ہمیں چار ہزار سال کے انسانی علوم کا ایک خاکہ بنانے میں آسانی اور ان کی معلومات نیز طرز زندگی سے بہت کچھ واقفیت حاصل ہو جاتی ہے۔

کتابِ ایوب بعد میں عہد نامۂ قدیم "بائبل" میں شامل کر دی گئی، اس میں حضرت ایوبؑ کی فریاد اس طرح لکھی ہے،

"میں سو جاتا، تب مجھے آرام ملتا۔"

زمین کے بادشاہوں اور شہزادوں کے ساتھ جنھوں نے اپنے لئے مقبرے بنائے۔

یا ان شاہزادوں کے ساتھ ہوتا جن کے پاس سونا تھا۔

جنھوں نے اپنے گھر چاندی سے بھر لئے تھے۔

یا پوشیدہ اسقاط حمل کی مانند میں وجود میں آیا۔

وہاں قیدی ملکر آرام کرتے ہیں اور داروغہ کی آواز سننے میں نہیں آتی"

فریاد کے ان اشعار میں جن باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ان سے چار ہزار سال پہلے کا انسان واقف تھا۔ اس وقت بادشاہ اور شہزادے ہوتے تھے، وہ سونا چاندی جمع کرتے تھے، ان دھاتوں کی اہمیت بھی تھی۔

بادشاہ اور شاہزادے مقبروں میں دفن کیے جاتے تھے۔

پوشیدہ طور پر اسقاط حمل ہوتے تھے۔

قیدی ہوتے تھے اور ان کی حفاظت کے لئے داروغہ مقرر تھے۔

اسی کتاب ایوب میں ہے۔

"کاش میرا کڑھنا تولا جا سکتا اور میری ساری مصیبت ترازو میں رکھی جاتی قادر مطلق کے تیر میرے جسم میں پیوست ہیں۔ میری روح انھیں کے زہر کو پی رہی ہے۔

کیا جنگلی گدھا اس وقت بھی چلتا رہتا ہے جب اسے گھانس مل جاتی ہے۔

یا کیا بیل چارہ پانے کے بعد بھی چیختا ہی رہتا ہے؛

کیا پھیکی چیز بے نمک کھائی جا سکتی ہے؟

کیا انڈے کی سفیدی میں کوئی مزہ ہے؟ کیا میرا جسم پیتل کا ہے۔؟

- قافلے اپنے راستے سے مڑ جاتے ہیں اور بیابان میں جا کر ہلاک ہو جاتے ہیں تیمار کے قافلے دیکھتے رہے، سبا کے کارواں ان کے انتظار میں رہے

- کیا انسان کے لئے زمین پر جنگ و جدل نہیں کیا اس کے دن مزدور کے سے نہیں ہوتے جب نوکر سائے کی آرزو کرتا ہے اور مزدور اپنی اجرت کا منتظر رہتا ہے"

حضرت ایوبؑ کا یہ نوحہ ان کی شدید بیماری کے وقت کا ہے جب ان کے جسم کے آبلے پھوٹ گئے تھے اور ان میں کیڑے پڑ گئے تھے۔ اس نوحے سے انسانی زندگی کی کچھ اور باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں چار ہزار سال پہلے کا آدمی ترازو سے کام لیتا تھا، تیر سے واقف تھا۔ زہر کی ماہیت کو جانتا تھا جنگلی گدھا۔ بیل اور چارہ بھی موجود تھا نمک کا استعمال ہوتا تھا۔ انڈے کھائے جاتے تھے اور پیتل سے کام لیا جاتا تھا۔

قافلے چلتے تھے۔ تیمار (عرب) کے قافلے اور سبا (یمن) کے قافلے

عراق جاتے تھے۔ جنگ وجدل سے انسان پریشان تھا۔نوکر اور مزدور ہوتے تھے۔ نوکرکوستانے کے لئے سائے کی تلاش رہتی تھی اور مزدور کو کام کی اجرت ملتی تھی۔

یہ ایک مہذب اور متمدن قوم کی تصویر ہے قوم یا سماج کی اس قوم کو وحشی اور جاہل کہ کرردکردینا آج کے انسان کی گمراہ خودی کاایک نمونہ ہے۔

چار ہزار سال پہلے قوم ایوب یقیناً مہذب اور متمدن تھی۔اس کے پاس علم بھی تھااور ادب بھی،

حضرت ایوبؑ اس قوم کے لئے ایک سوال قائم کرتے ہیں۔ ’’حکمت کہاں ملے گی، اور فرد کی جگہ کہاں ہے ؟‘‘

پھر ایک ادبی جواب دیتے ہیں۔

’’یقیناً چاندی کی کان ہوتی ہے اور سونے کی جگہ جہاں وہ تپایا جاتا ہے۔ لوہازمین سے نکالا جاتا ہے اور پیتل پتھر میں سے گلایا جاتا ہے انسان تاریکی کے تہ تک پہونچتا ہے اور ظلمات اور موت کے سائے کی انتہا تک پتھروں کی تلاش کرتا ہے۔

آبادی سے دور وہ سرنگ لگاتا ہے۔ آنے جانے والوں کے پاؤں کی آہٹ سے بے خبر اور لوگوں سے دور وہ لٹکتے اور جھولتے ہیں۔

اور زمین اس سے خوراک پیدا ہوتی ہے اور اس کے اندر آتش فشاں سے انقلاب آتے رہتے ہیں۔

اس کے پتھروں میں نیلم ہے اور اس میں سونے کے ذرے ہیں۔

اس راہ کو کوئی شکاری پرندہ نہیں جانتا۔نہ بازؔ کی آنکھ نے اسے دیکھا ہے۔نہ قد اور جانور اس پر چلے ہیں۔نہ خونخوار ببر ادھر سے گزرا ہے۔

-وہ چقماق کی چٹان پر ہاتھ لگاتا ہے۔وہ پہاڑوں کو جڑ سے اکھاڑ دیتا ہے۔ وہ چٹانوں میں سے نالیاں نکالتا ہے۔اسکی آنکھ ہر بیش قیمت چیز کو دیکھ

لیتی ہے۔ وہ دریاؤں کو روک لیتا ہے اور وہ آگے جانے سے رک جاتی ہیں اور پوشیدہ چیز کو وہ روشنی میں نکال لاتا ہے۔

لیکن حکمت کہاں ملے گی اور خرد کی جگہ کہاں ہے؟

نہ انسان اس کی جگہ جانتا ہے، نہ وہ زندوں کی سرزمین میں ملتی ہے۔

زمین کی تہہ کہتی ہے----"وہ مجھ میں نہیں ہے"۔

سمندر کہتا ہے----"وہ میرے پاس نہیں"۔

نہ وہ سونے کے بدل مل سکتی ہے۔ نہ چاندی اس کی قیمت کے لیے تولی جائے گی نہ اُوفیر کا سونا اس کی قیمت ہو سکتا ہے۔ اور نہ قیمتی سلیمانی پتھر اور نیلم، نہ سونا اور شیشہ اس کی برابری کر سکتے ہیں، نہ خالص سونے کے زیور اس کا معاوضہ ٹھہریں گے۔ مونگے اور بلّور کا نام بھی نہیں لیا جائے گا۔ بلکہ حکمت کی قیمت مرجان سے بڑھ کر ہے۔

نہ کوش کا پکھراج اس کے برابر ٹھہرے گا۔ نہ خالص سونا اس کی قیمت ہو گا۔

پر حکمت کہاں سے آتی ہے؟

اور خرد کی جگہ کہاں ہے؟

وہ سب زندوں کی آنکھوں سے چھپی ہوئی ہے اور ہوا کے پرندوں سے پوشیدہ رکھی گئی ہے۔

ہلاکت اور موت کہتی ہے----"ہم نے اپنے کانوں سے اس کی افواہ تو سنی ہے لیکن خدا ہی اس کی راہ کو جانتا ہے اس کی جگہ سے واقف ہے اس لیے کہ خدا زمین کی انتہا تک دیکھتا ہے اور سارے آسمان کے نیچے اس کی نظر ہے تاکہ وہ ہوا کا وزن قائم کرے۔ وہ پانی کو پیمانے سے ناپتا ہے۔

جب اس نے بارش کے لیے قانون اور بادلوں کی بجلی کے لیے راستہ مقرر کیا تبھی خدا نے حکمت اور خرد کو دیکھا اور اس کا بیان کیا۔

اس نے اسے قائم کیا بلکہ اسے ڈھونڈھ نکالا۔

اس نے انسان سے کہا-----"دیکھ خدا کا خوف ہی حکمت ہے۔ اور بدی سے دور رہنا خرد ہے"۔

یہ سب سے قدیم نظم ہے۔ حکمت اور خرد کا اس سے شاندار اور ادبی بیان اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہ علم و عقل یا علم و ادب کے بارے میں ایک حسین تنقید بھی ہے۔ حکیم یا پروفیسر یا فلسفی یا اہل علم کے لیے خوفِ خدا لازمی ہے اور عقل مند وہ ہے جو بدی سے دور رہتا ہے۔

گویا چار ہزار سال پہلے کی یہ تنقید ہمارے سامنے ایک اصول پیش کرتی ہے ،وہ اصول یہ ہے کہ علم اور عقل کو سونے ،چاندی ،جواہرات اور دولت سے خریدا نہیں جا سکتا، انسان پہاڑوں کو چھید سکتا ہے دریاؤں کے رخ موڑ سکتا ہے، سمندر کی تہہ سے مونگے اور موتی نکال سکتا ہے۔ موت وحیات کے سائے تک پہونچ سکتا ہے۔ لیکن اگر خدا کا خوف نہیں ہے تو علم بیکار ہے اور اگر بدی سے بچنے کی صلاحیت نہیں ہے تو عقل سے کوئی فائدہ نہیں۔

کتاب ایوبؑ نے اپنے دور کے لوگوں پر ضرور اثر ڈالا ہوگا۔ کیونکہ جب حضرت ایوبؑ اپنی بیماری سے اچھے ہوئے تو ان کے رشتے دار اور جاننے پہچاننے والے آئے۔ حضرت ایوبؑ نے انھیں کھانا کھلایا، لوگوں نے ان کی بیماری کی تکلیفوں پر تسلی دی۔

پھر اس دور کی رسم کے مطابق ایک ایک سکہ اور ایک سونے کی بالی انھیں نذر کی۔

کتاب ایوبؑ ایک بڑا ادبی کارنامہ ہے۔ جو محفوظ رہ گیا ہے، اگر یہ نہ ہوتا تو ہم چار ہزار سال پہلے کے انسان کے عقیدے، رسم ورواج، طرز حکومت علم وعقل کے اور تہذیب وتمدن کے بارے میں ایک بات بھی معلوم نہیں کر سکتے تھے۔

لسانیات کے ماہروں کا دعویٰ ہے کہ کتاب ایوب کے بعد سب سے قدیم کتاب رگ وید ہے جو تین ہزار سال سے اوپر کی کتاب ہے لیکن اگر کتاب ایوب چار ہزار سال پرانی ہے تو ظاہر ہے کہ جس قوم نے کتاب ایوب لکھی ہے اس نے اور کتابیں بھی لکھی ہوں گی۔ افسوس کے وہ علم ہمارے پاس محفوظ نہیں ہے۔

مذہبی کتابوں میں ہمیں صحیفۂ ابراہیم کا ذکر ملتا ہے، یہ صحیفہ بھی چار ہزار سال سے کچھ ہی کم عمر رکھتا ہوگا لیکن اس صحیفے کا کوئی نسخہ انسان کو حاصل نہ ہو سکا۔

کتاب ایوب کے بعد تحریری کتاب توریت ہے۔ یہ دس تختیاں تھیں۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر تشریف لے گئے تو وہاں انھوں نے چالیس دن عبادت وریاضت میں صرف کئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انھیں دس تختیاں دیں جن پر قوم بنی اسرائیل کے لیے قانون لکھا ہوا تھا۔

ممکن ہے کہ کچھ لوگ اس بات سے اختلاف کریں کہ وہ تختیاں خدا کی طرف سے دی گئی تھیں۔ ہم اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے چالیس دن کوہِ طور پر بیٹھ کر حضرت موسیٰ ہی نے وہ دستور مرتب کیا تھا تب بھی توریت نے انسانی زندگی پر زبردست اثر ڈالا اور ایک پوری قوم نے توریت کے احکام کے مطابق اپنے کو ڈھالنے کی کوشش شروع کر دی۔

جن لوگوں کو مذہب سے تعصب ہے وہ الہامی کتابوں کی قدر قیمت سے انکار کر دیتے ہیں اور اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ ان کتابوں نے انسان کی زندگی پر کتنا زبردست اثر ڈالا ہے۔ ایسا اثر جو صدیوں کے الٹ پھیر کے بعد آج موجود ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے دستور پر آج چھبیس ستائیں سو سال بعد بھی ایک قوم یہود عمل کرنے کا دعویٰ رکھتی ہے اور اس کی زندگی پر توریت کی زبردست چھاپ بھی ہے۔

شادی بیاہ کے بارے میں انسان کے پاس کوئی دستور نہیں تھا، توریت نے پہلی مرتبہ رشتوں کا احترام کرنا سکھایا۔ اس وقت تک قومیں اپنی بہنوں، خالاؤں اور پھوپھیوں سے بھی شادی کر لیا کرتی تھیں یا باپ کے مرنے کے بعد اس کی عورتوں کو بھی میراث میں لیکر اپنی بیویاں بنالیا کرتی تھیں۔

توریت نے اپنے احکام میں ان رشتوں کو مکمل کر دیا اور ایک قوم کے لیے دستور العمل بنادیا۔ وہ دستور یہ تھا۔

"تم میں سے کوئی اپنی قریبی رشتے دار کے پاس اس کے بدن کو بے پردہ کرنے نہ جائے۔ میں خدا ہوں۔ تو اپنی ماں کے بدن کو بے پردہ نہ کیجیو کیونکہ وہ تیرے باپ کا بدن ہے اور وہ تیری ماں ہے۔

تو اپنے باپ کی بیوی کے بدن کو بے پردہ نہ کیجیو کیونکہ وہ تیرے باپ کا بدن ہے۔

تو اپنی بہن کے بدن کو چاہے وہ تیرے باپ کی بیٹی ہو یا تیری ماں کی خواہ وہ گھر میں پیدا ہوئی ہو یا اور کہیں، بے پردہ نہ کیجیو۔

تو اپنی پوتی یا نواسی کے بدن کو بے پردہ نہ کیجیو کیونکہ ان کا بدن تو تیرا ہی بدن ہے۔

تیرے باپ کی بیوی کی بیٹی جو تیرے باپ سے پیدا ہوئی ہے، تیری بہن ہے تو اس کے بدن کو بے پردہ نہ کیجیو

تو اپنی پھوپھی کے بدن کو بے پردہ نہ کیجیو کیونکہ وہ تیرے باپ کی قریبی رشتے دار ہے۔

تو اپنی خالہ کے بدن کو بے پردہ نہ کیجیو کیونکہ وہ تیری ماں کی قریبی رشتے دار ہے۔

تو اپنے باپ کے بھائی کے بدن کو بے پردہ نہ کیجیو 'یعنی اس کی بیوی کے پاس نہ جائیو، وہ تیری چچی ہے۔

تو اپنی بہو کے بدن کو بے پردہ نہ کیجیو کیونکہ وہ تیرے بیٹے کی بیوی ہے۔

تو اپنی بھاوج کے بدن کو بے پردہ نہ کیجیو کیونکہ وہ تیرے بھائی کا بدن ہے۔

تو کسی عورت اور اس کی بیٹی دونوں کے بدن کو بے پردہ نہ کیجیو اور نہ تو اس عورت کی پوتی یا نواسی بیاہ کر کے ان سے کسی کے بدن کو بے پردہ نہ کیجیو کیونکہ وہ دونوں اس عورت کی قریبی رشتہ دار ہیں۔

یہ بڑی خباثت ہے۔

تو اپنی سالی سے بیاہ کر کے اسے اپنی بیوی کی سوت نہ بنائیو کیونکہ دوسری کے جیتے جی اس کے بدن کو بھی بے پردہ کرے۔

اور تو عورت کے پاس جب تک وہ حیض کی وجہ سے ناپاک ہے، اس کے بدن کو بے پردہ کرنے نہ جائیو۔

اور تو اپنے کو نجس کرنے کے لیے اپنے ہمسائے کی بیوی سے صحبت نہ کیجیو۔

تو مرد کے ساتھ صحبت نہ کیجیو جیسی کے عورت کے ساتھ کرتا ہے۔
یہ نہایت مکروہ کام ہے تو اپنے کو نجس کرنے کے لیے کسی جانور سے صحبت نہ کیجیو اور نہ کوئی عورت کسی جانور کے سامنے ہم صحبت ہونے کے لیے اس کے سامنے کھڑی ہو کیونکہ یہ الٹی بات ہے۔

تم ان کاموں میں سے کوئی کام کر کے اپنے کو گناہ میں آلودہ نہ کرنا کیونکہ میں جن قوموں کو تمہارا محکوم بنانے والا ہوں، وہ یہ سب کام کر کے اپنے کو گناہوں میں آلودہ کر چکی ہیں اور ان کا ملک بھی گناہوں میں آلودہ ہو گیا ہے، اس لیے میں انھیں ان کی بدکاری کی سزا دے رہا ہوں اور یہ سرزمین ان لوگوں کو اگلے دے رہی ہے۔

ایسا نہ ہو کہ جس طرح اس ملک نے اس قوم کو جو تم سے پہلے وہاں تھی اُگل دیا ہے، اسی طرح تم کو بھی جب تم گناہوں سے اسے آلودہ کر دو گے تو اُگل دے"۔

توریت سے طاقت حاصل کر کے یہودیوں نے کنعان پر قبضہ کر لیا اور وہاں کی قوم کو یا تو جلاوطن کر دیا یا غلام بنا لیا۔ حالانکہ قومِ بنی اسرائیل خود مصر میں غلام تھی اور وہاں سے جماعتی فرار کے بعد ریگستانِ سینا میں ٹھوکریں کھا رہی تھی۔

جلد ہی یہودیوں نے پڑوس کی تمام قوموں کو شکست دے دی اور کنعان میں اپنی حکومت کو مضبوط و مستحکم بنا لیا۔ توریت کے بعد بھی یہودیوں میں علم و ادب کا چرچا رہا۔ ہمیں عہد قدیم کی دوسری کتاب حضرت داؤد کی زبور کی شکل میں ملتی ہے۔ یہ نظم کی کتاب ہے۔ حضرت داؤد نے اس کے سرگم بھی بنائے اور گانے کے وقت بھی مقرر کیے۔ وہ ایک جفاکش سپہ سالار اور عظیم الشان بادشاہ

تھے۔ حالانکہ بچپن بھیڑ، بکری چرانے میں گزرا تھا۔ ان کی شخصیت کی رنگارنگی اور ادب سے وابستگی پر حیرت ہوتی ہے۔

وہ گڈریے کے لڑکے تھے۔ پھر سپاہی بنے، پھر بادشاہ وقت کے باغی ہو کر فرار اور شکست کی زندگی اختیار کی۔ پھر عروج حاصل کیا اور یہودیوں کے بادشاہ ہو گئے۔

وہ پیغمبر بھی تھے۔ زبور اللہ کا کلام ہے جو نظم کی صورت میں ان پر نازل ہوا۔ وہ گیت کی صورت میں ہے جو مزامیر پر گایا جاتا۔

حضرت داؤدؑ بہترین موسیقار بھی تھے اور دستکار بھی۔ انہوں نے لوہے کو ڈھالنا شروع کیا اور جنگ کے لباس کے طور پر زرہ ایجاد کی مشہور ہے کہ ان کے ہاتھ میں پتھر بھی موم ہو جاتا تھا۔

حضرت داؤدؑ کا زمانہ لگ بھگ چوبیس سو سال پہلے کا زمانہ ہے۔ ہمیں اس وقت کی انسانی زندگی اور تہذیب و معاشرت کے بارے میں زبور اور حضرت داؤدؑ کی زندگی سے بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔

زبور کا ایک گیت اس طرح ہے۔

"خداوند کی حمد کرو۔

اے میری جان خداوند کی حمد کر میں زندگی بھر خداوند کی حمد کروں گا۔

جب تک میرا وجود ہے میں اپنے خدا کی تعریف کروں گا نہ امراء پر بھروسہ کرو نہ آدم زاد پر وہ بچا نہیں سکتے وہ مرتے ہیں تو مٹی میں مل جاتے ہیں۔ اس دن ان کے منصوبے فنا ہو جاتے ہیں۔

خوش نصیب وہ ہے جس کا مددگار یعقوبؑ کا خدا ہے اور جس کی امید خداوند خدا سے ہے۔ جس نے آسمان، زمین اور سمندر اور جو کچھ ان میں ہے۔ سب کو

پیدا کیا۔

جو سچائی کو ہمیشہ قائم رکھتا ہے۔ جو مظلوموں کا انصاف کرتا ہے جو بھوکوں کو کھانا دیتا ہے۔ خداوند قیدیوں کو آزاد کرتا ہے خداوند اندھوں کی آنکھیں کھولتا ہے خداوند جھکے ہوئے کو اٹھا کر کھڑا کرتا ہے۔

خداوند بچوں سے محبت رکھتا ہے۔ خداوند پردیسیوں کی حفاظت کرتا ہے۔

وہ یتیم اور بیوہ کو سنبھالتا، وہ شریروں کی راہ ٹیڑھی کر دیتا ہے۔

خداوند ابد تک سلطنت کریگا"۔

ایک دوسرے گیت سے اس وقت کی عبادت کا طریقہ معلوم ہوتا ہے

"خداوند کی حمد کرو۔

تم خداوند کے مقدس گھر میں اس کی حمد کرو اس کی قدرت کے فلک پر اس کی حمد کرو۔

اس کی بڑی عظمت کے مطابق، اس کی حمد کرو۔

بھونپو کی آواز کے ساتھ اس کی حمد کرو۔

بربط اور ستار پر اس کی حمد کرو۔

دَف بجاتے ہوئے اور ناچتے ہوئے اس کی حمد کرو۔

تار والے سازوں اور بانسری کے ساتھ اس کی حمد کرو۔

بلند آواز جھانجھ کے ساتھ اس کی حمد کرو۔

ہر جاندار خدا کی حمد کرے۔

خداوند کی حمد کرو"

حضرت داؤدؑ کی حکومت بڑی ہی باشوکت تھی، اس کی بنیاد زبور کے محسور کن نغمات پر تھی۔ جب وہ زبور کی آیات مزامیر پر گانے لگتے تھے تو پرندے

اور حیوان بھی ان کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔

ابھی حضرت داوٗدؑ کے نغمات کی جھنکار ختم نہیں ہوئی تھی کہ ان کے جلیل القدر فرزند حضرت سلیمانؑ کی امثال کی آواز فضا میں گونجنے لگی۔

سلیمان کی امثال دانش و عقل کا خزانہ ہے۔ ان میں بڑی حقیقت پسند اور شاعرانہ تازگی ملتی ہے۔ جو بات علم کے بارے میں ان کے زمانے سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے کہی گئی تھی۔ اس کو سلیمان بھی یاد دلاتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

"حکمت اور تربیت حاصل کرنے اور عقل کی باتوں کا امتیاز کرنے کے لئے عقل مندی اور صداقت اور عدل اور راستی میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے سادہ دلوں کو ہوشیاری اور جوانوں کو علم اور تمیز بخشنے کے لئے تاکہ دانا آدمی سن کر علم میں ترقی کرے اور عقل مند آدمی درست فیصلے تک پہونچے۔ تاکہ تمثیل میں بیان ہونے والی باتوں اور عقل مندی کے تذکروں اور ان کے معموں کو سمجھ سکے۔ ان سب باتوں کے لئے خدا کا خوف ہی علم کی ابتداء ہے۔

احمق وہ ہیں جو حکمت اور تربیت کو حقیر سمجھتے ہیں۔

اے میرے بیٹے، اپنے باپ کی تربیت پر دھیان دے۔

اور اپنی ماں کی دی ہوئی تعلیم کو ترک نہ کر۔ کیونکہ وہ تیرے سر کے لئے زینت کا سہرا اور تیرے گلے کے لئے زینت کا ہار ہو گی۔

حکمت (علم و فلسفہ) حاصل کر۔ فہم (معلومات) حاصل کر حکمت کو ترک نہ کرنا۔ وہ تیری حفاظت کرے گی۔ اس سے محبت رکھنا، وہ تیری نگہبان ہو گی۔

حکمت افضل اصل ہے۔ پس حکمت حاصل کر، اس کی تعظیم کر وہ تجھے سرفراز کریگی۔

جب تو اسے گلے لگائے گا تو وہ تجھے عزت بخشے گی۔ وہ تیرے سر پر زینت کا سہرا باندھے گی اور تجھکو جمال کا تاج عطا کریگی۔

حضرت سلیمانؑ کا جو کلام ہم تک پہونچا ہے۔ وہ بہت زیادہ نہیں ہے، لیکن علم و حکمت کا دریا ہے جو الفاظ میں بہ رہا ہے۔ زبان میں بڑی روانی ہے اور مضامین نصیحت آمیز اور دلکش ہیں۔ ہر بات حکمت کی تعلیم سے شروع کرتے ہیں۔حکمت علم و فلسفے کا دوسرا نام ہے۔ وہ انسان کیلئے حکمت، فہم، دانش مندی اور تربیت کو بہت ضروری سمجھتے ہیں۔

ان کی امثال میں پانچواں باب اس طرح شروع ہوتا ہے۔

"اے میرے بیٹے، میری حکمت پر توجہ دے۔ میری فہم پر کان لگا تاکہ تو تمیز کو محفوظ رکھے اور تیرے لب علم کے نگہبان ہوں۔

بیگانہ عورت کے ہونٹوں سے شہد ٹپکتا ہے اور اس کی زبان تیل سے زیادہ چکنی ہے لیکن اس کا انجام کڑوے دانے کے مانند تلخ ہے۔ اور دو دھاری تلوار کے مانند تیز ہے۔

اس لئے اے میرے بیٹو، میری سنو، میرے منہ کی باتوں سے برگشتہ خاطر نہ ہو۔

اس عورت سے اپنی راہ دور رکھ اور اس کے دروازے کے پاس بھی نہ جا۔ ایسا نہ ہو کہ تو اپنی آبرو کسی غیر کے اور اپنی زندگی بے رحم کے حوالے کردے۔

تو اپنی جوانی کی بیوی کے ساتھ شاد رہ۔ پیاری ہرنی اور دلفریب غزالہ کی مانند۔

اس کی چھاتیاں تجھے ہر وقت آسودہ رکھیں اور اس کی محبت تجھے ہر وقت فریفتہ رکھے۔

اے میرے بیٹے ، تجھے بیگانہ عورت کیوں فریفتہ کرے اور تو غیر عورت سے کیوں ہم آغوش ہو۔"

ساتویں تمثیل میں ایک شاعرانہ واقعہ بیان کرتے ہیں،

"اے میرے بیٹے میری بات کو مان۔

حکمت سے کہ۔ تو میری بہن ہے اور فہم کو اپنا رشتے دار بنا تا کہ وہ تجھکو غیر عورت سے بچائیں، یعنی بیگانہ عورت سے جو چاپلوسی کی باتیں کرتی ہے۔ (ایک دن) میں نے اپنے گھر کی کھڑکی سے دیکھا۔ یعنی جھروکے سے باہر نگاہ کی ایک بے عقل جوان کو نادانوں کے درمیان دیکھا، یعنی مجھے نوجوانوں کے درمیان دکھائی دیا۔ وہ اس عورت کے گھر کے پاس گلی کی موڑ سے جا رہا تھا۔ اس نے اس عورت کے گھر کا راستہ لیا۔

دن چھپے۔ شام کے وقت۔ رات کے اندھیرے اور تاریکی میں اور دیکھو وہاں اس سے ایک عورت آملی جو دل کی چالاک اور کسبی لباس پہنے تھی۔ وہ ہر جائی اور آوارہ ہے، اس کے پاؤں اپنے گھر میں نہیں ٹکتے۔

ابھی کوچوں میں ہے، ابھی بازاروں میں، اور ہر موڑ پر گھات میں بیٹھی ہے سو اس عورت نے اس نوجوان کو پکڑ کر چوما اور بے حیائی کے ساتھ کہنے لگی - قربانی مجھ پر فرض تھی، آج میں نے اپنی نذریں ادا کی ہیں یہ بھی سوچا کہ تجھ سے ملاقات کروں اور کسی طرح تیرا دیدار نصیب ہو سو تو مجھے مل گیا۔ میں نے اپنے بستر پر کامدار غالیچے اور مصر کے دھاری دار کپڑے بچھائے ہیں۔ میں نے اپنے بستر کو عود مُر اور دار چینی سے معطر کیا ہے۔ آ، ہم صبح تک جی بھر کر عشق بازی کریں۔ اور محبت کی باتوں سے دل بہلائیں۔

میرا شوہر بھی گھر میں نہیں ہے۔ اس نے دور کا سفر کیا ہے۔ وہ اپنے

ساتھ روپے کی تھیلی لے گیا ہے۔اور پورے چاند کے وقت گھر آئے گا۔"

اس طرح اس نے میٹھی میٹھی باتوں سے نوجوان کو پھسلالیا۔اور اپنے لبوں کی چاپلوسی سے اسے بہکالیا۔

نوجوان فوراً اس کے پیچھے ہولیا۔جیسے بیل ذبح ہونے کے لئے جاتا ہے یا بیڑیوں میں احمق جکڑے جاتے ہیں۔جیسے پرندہ جال کی طرف تیزی کے ساتھ جاتا ہے۔اور نہیں جانتا کہ وہ اس کی ہلاکت کے لئے ہے۔اور تیر اس کے جگر کے پار ہو جائے گا۔

اے نوجوانوں کیا حکمت پکار نہیں رہی ہے اور عقل آواز بلند نہیں کر رہی ہے۔وہ راہ کے کنارے،اونچی جگہ پر،چوٹیوں پر چوراہوں پر کھڑی ہو جاتی ہے۔

پھاٹکوں کے پاس جہاں سے شہروں میں داخل ہوا جاتا ہے۔وہ زور سے پکارتی ہے-اے انسانو،میں تمہیں پکار رہی ہوں اے بنی آدم،تجھے آواز دیتی ہوں۔

اے سادہ دلو،ہوشیاری سیکھو،اے احمقوں،دل کے دانا بنو۔ چاندی کو نہیں بلکہ میری تربیت کو قبول کرو۔کندن کو نہیں علم کو لو۔کیونکہ حکمت مرجان سے افضل ہے۔اور سب پسندیدہ چیزوں میں بے نظیر۔"

حضرت سلیمانؑ بھی اپنے عظیم باپ حضرت داؤدؑ کی طرح پیغمبر بادشاہ شاعر ادیب اور علم و حکمت کے بلند مینار تھے۔انہوں نے ایسی عجیب وغریب عمارتیں بنوائیں،جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی تھی۔ان کے دور میں لوہے کو پگھلانے والی بڑی بڑی بھٹیاں بنائی گئیں۔شاید انہیں فضا میں اڑنے کی سائنس کا بھی علم تھا۔

جب انہوں نے اپنے دور حکومت میں علم و حکمت پر اتنا زور دیا تھا۔ تو

ظاہر ہے کہ ان کے ملک میں اہل علم کی کمی نہ ہوگی۔ حکمت اور فلسفے کی تعلیم کے ساتھ انہوں نے اپنی تحریروں میں اچھی تربیت کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور اس تربیت کا گہوارہ باپ کی حکمت اور ماں کی تربیت کو قرار دیا ہے۔

حضرت سلیمانؑ کا زمانہ لگ بھگ تیس سو سال پہلے کا زمانہ ہے۔ جب ہم انکی ''امثال'' اور ''غزل الغزلات'' کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس روایت پر غور کرتے ہیں جو مغرب سے چلی ہے۔-اور ہم نے آنکھیں بند کر کے اسے قبول کر لیا ہے تو کتنا تعجب ہوتا ہے۔

وہ روایت یہ ہے کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ سے علم کی ابتداء ہوئی ہے۔ اس نشاۃ ثانیہ کو مشکل سے چار پانسو سال کا زمانہ گزرا ہے۔ گویا چار پانسو سال سے پہلے دور جہالت تھا۔ ممکن ہے یورپ کے لوگوں نے یہ بات اپنے بارے میں کہی ہو کیونکہ یورپ عربوں کے عروج سے پہلے واقعی جہالت کی تاریکی میں بھٹک رہا تھا۔

ہمارا سرمایہ چار ہزار سال پرانا ہے۔ ہمارا سے مطلب ہے اردو زبان کا سرمایہ کیونکہ اردو اسی روایت اور ادب کا خاکہ ہے جو ایوبؑ داؤدؑ اور سلیمانؑ سے وراثتاً منتقل ہوتا رہا ہے۔

علم وادب کی دنیا میں حضرت سلیمانؑ کا بڑا مرتبہ ہے۔ ان کا انداز بیان بھی نرالہ ہے۔ وہ نصیحت کی بات بہت ہی شاعرانہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ انہیں اپنے شہر یروشلم (بیت المقدس) سے عشق ہے۔ وہ اپنے وطن کی ہر چیز سے محبت کرتے ہیں۔ ان کی غزلیں حب الوطنی کا شاہکار ہیں۔ ہم ان کی غزلوں کے چند نمونے پیش کرتے ہیں۔

''اے یروشلم کے بیٹو میں سیاہ فام لیکن خوبصورت ہوں۔ قیدار کے

خیموں اور سلیمان کے پردوں کی مانند۔

اے میری پیاری، میں نے تجھے فرعون کے رتھ کی گھوڑیوں میں سے ایک گھوڑی کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

تیرے رخسار مسلسل زلفوں کے سائے میں کیسے خوش نما ہیں۔ اور تیری گردن موتیوں کے ہاروں میں۔

ہم تیرے لئے سونے کے طوق بنائیں گے اور ان میں چاندی کے پھول جڑیں گے۔

میرا محبوب میرے لئے دستۂ مر ہے جو رات بھر میری چھاتیوں کے درمیان پڑا رہتا ہے۔

میرا محبوب، میرے لئے عین جدی کے انگورستان کی مہندی کے پھولوں کا گچھا ہے۔

دیکھ تو خوبصورت ہے میری پیاری، دیکھ تو خوبصورت ہے۔ تیری آنکھیں نقاب کے نیچے دو کبوتر ہیں۔

تیرے بال بکریوں کے گلے کی مانند ہیں جو کوہِ جلعاد پر بیٹھی ہوئی ہیں۔

تیرے دانت بھیڑوں کے گلے کی مانند ہیں جن کے بال کتر کر انھیں غسل دیا گیا ہو۔ جن میں سے ہر ایک نے دو بچے دئے ہوں اور ان میں کوئی بانجھ نہ ہو۔

تیرے ہونٹ قرمزی ڈورے ہیں۔ تیرا منہ دلفریب ہے۔ تیری پیشانی نقاب کے نیچے انار کے ٹکڑوں کی مانند ہے۔

تیری گردن داؤد کا برج ہے جو سلاح خانے کے لئے بنا۔ جس پر ہزار سپریں لٹکائی گئیں۔ وہ سب شہ سواروں کی سپریں ہیں۔

تیری دونوں چھاتیاں دو جڑواں آہو بچے ہیں جو سوسنوں میں چرتے ہیں۔

جب تک دن ڈھلے اور سایہ بڑھے میں مر کے پہاڑ اور لوبان کے ٹیلے پر جا رہوں گا۔

اے میری پیاری، تو سراپا جمال ہے۔ تجھ میں کوئی عیب نہیں۔ لبنان سے میرے ساتھ اے دلہن۔ تو لبنان سے میرے ساتھ چلی آ۔

امانہ پہاڑ کی چوٹی پر سے -سیز اور حرمون کی چوٹی پر سے شیروں کی ماندوں سے اور چیتوں کے پہاڑوں پر سے نظر دوڑا۔

اے میری پیاری میری شریکِ زندگی تو نے میرا دل لوٹ لیا اپنی ایک نظر سے۔ اپنی گردن کے ایک طوق سے تو نے میرا دل غارت کر دیا اے میری پیاری - میری شریک حیات تیرا عشق کیا خوب ہے۔ تیری محبت سے زیادہ لذیذ ہے اور تیرے عطر کی مہک ہر طرح کی خوشبو سے بڑھ کر ہے۔

اے میری زوجہ تیرے ہونٹوں سے شہد ٹپکتا ہے۔ تیری زبان میں شہد اور شکر ہے۔

تیری پوشاک کی خوشبو لبنان کی سی ہے۔
میری پیاری میری بیوی ایک مقفل باغیچہ ہے۔
تیرے باغ کے پودے لذیذ میوہ دار انار ہیں۔
مہندی اور سنبل بھی ہیں۔

جٹاماسی، زعفران، بید مشک اور دار چینی اور لوبان کے تمام درخت مر اور عود اور ہر طرح کی مخصوص خوشبو۔

تو باغوں میں ایک منبع - آبِ حیات کا چشمہ اور لبنان کا جھرنا ہے۔

اے بادِ شمال بیدار ہو۔اے بادِ جنوب چلی آ۔

میرے باغ پر سے گزر تاکہ اس کی خوشبو پھیلے۔

میری محبوبہ اپنے باغ میں آئے اور اپنے لذیذ میوے کھائے۔ میں اپنے باغ میں آیا ہوں۔اے میری پیاری، میری زوجہ۔

میں نے اپنا مُر اپنے بلسان کے ساتھ جمع کر لیا۔ میں نے اپنا شہد چھتے سمیت کھالیا۔ میں نے اپنی مئے دودھ سمیت پی لی۔

حضرت سلیمانؑ ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ان کے اشعار تشبیہات اور کنائے بڑے ہی لطیف اور شاعرانہ ہیں۔وہ اپنی شوکت و عظمت کو بھی سمجھتے ہیں۔ اپنے بارے میں لکھتے ہیں۔

"یہ کون ہے جو مُر اور لوبان سے اور سوداگروں کے تمام عطروں سے معطر ہو کر بیابان سے دھوئیں کے ستون کی مانند چلا آرہا ہے۔ دیکھو یہ سلیمان کی پالکی ہے جس کے ساتھ اسرائیلی بہادروں میں سے ساٹھ پہلوان ہیں۔ وہ سب کے سب شمشیر زن اور جنگ کے ماہر ہیں۔ رات کے خطرے کی وجہ سے ہر ایک کی تلوار اس کی ران پر لٹک رہی ہے۔

سلیمان بادشاہ نے لبنان کی لکڑیوں سے اپنے لئے ایک پالکی بنوائی اس کے ڈنڈے چاندی کے بنوائے۔اس کی نشست سونے کی اور گدی ارغوانی بنوائی اور اس کے اندر کا فرش یروشلم کی بیٹیوں نے عشق سے مرصع کیا۔

اے صیہون کی بیٹیو۔ باہر نکلو اور سلیمان بادشاہ کو دیکھو، اس تاج کے ساتھ جو اس کی ماں نے بیاہ کے دن اور اس کے دل کی شادمانی کے روز اس کے سر پر رکھا۔"

اس ادبی خزانے نے یہودیوں کو علم و عقل کی طرف مائل کیا۔ انہوں

نے اپنی عظمت کا سکہ بٹھادیااور تمام قومیں ان کے پاس علم اور عقل حاصل کرنے آنے لگیں۔

بابل کے بادشاہ بخت نصر نے قوم یہود کو شکست دے کر یروشلم پر قبضہ کرلیا۔ پھر نوے سال کے بعد فارس کے بادشاہ کیخسرو یاذوالقرنین نے بابل کی حکومت کو شکست دے کر قوم یہود کو پھر یروشلم میں آباد کیا لیکن کیخسرو کے بیٹے دارا کے دورِ حکومت میں یونان کے سکندر نے طوفان کی طرح پورے وسط ایشیا اور مصر کو روندڈالا۔ دارا مارا گیا۔ یہودی غلام بن گئے مصر کی حکومت فرعون کے ہاتھ سے نکل کر یونانیوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔

سکندر اور بخت نصر کے حملوں سے کتنی ہی قومیں صفحۂ ہستی سے نابود ہوگئیں۔ وسط ایشیاء کی کتنی ہی قومیں جلاوطن ہو کر کہیں سے کہیں نکل گئیں اور ان کی قومی حیثیت کا نشان بھی باقی نہیں رہا۔مصر کے فرعون بھی فنا ہو گئے۔ خود سکندر کی قوم بھی گوشۂ گمنامی میں چلی گئی۔ لیکن یہودی سیاسی تباہی و بربادی کے باوجود توریت زبور اور امثال سے چمٹے رہے۔ انہوں نے ان کتابوں کے بلند اصولوں پر عمل نہیں کیا لیکن انہیں بنیاد بنا کر اپنی جماعت کو منتشر ہونے سے بچالیا۔ کوئی دوسری قوم یہودیوں کی طرح ظلم وستم کا نشانہ بنائی گئی ہوتی تو اس کا نام بھی تاریخ کے صفحات پر باقی نہ رہتا۔ وہ موسیٰؑ، داؤدؑ اور سلیمانؑ کی کتابیں تھیں۔ جنہوں نے یہودیوں کو ایک قوم۔ ایک خاندان اور ایک مذہب کی صورت میں زندہ رکھا۔

جب یہودی یونانیوں کے غلام بن گئے تھے اسی وقت ایک اور کارنامہ بھی پیش آیا

یہودیوں کے گھرانے ہی میں حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے، جوان ہو کر

انہوں نے یہودیوں کی غلط روش کے خلاف اعلان بغاوت کیا۔ لگ بھگ چھ سات سال انہوں نے یروشلم کے ارد گرد یہودیوں کو توریت کی طرف ایمانداری کے ساتھ واپس آنے کے لئے تقریریں کیں۔

یہودی علماء نے ان پر کفر کا فتویٰ لگایا اور یونانی حکام نے کہا جاتا ہے کہ انہیں سولی پر چڑھا کر موت کی سزا دے دی۔

اس واقعے کے بعد حضرت عیسیٰؑ کے گیارہ مرید جو حواری کہلاتے تھے۔ ان کی تقریروں کو جمع کرنے لگے انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کے حالات اور ان کی تقریروں کو کتابی شکل میں جمع کیا اور لوگوں تک پہونچایا۔

یہ کتابیں ایک مظلوم اور بے بس انسان کی زندگی کا نقشہ پیش کرتی تھیں۔ اس کے ساتھ جبر و ظلم کا برتاؤ کیا گیا۔ حالانکہ اس سے کبھی کسی کو ذرا سا نقصان بھی نہیں پہونچا تھا۔ وہ سب کے ساتھ بھلائی کرتا تھا۔

ان کتابوں کے پڑھنے کے بعد ہر شخص کے دل میں حضرت عیسیٰ سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے، اس دور کی جنگ و جدل اور ظلم و ستم کی ستائی ہوئی مخلوق کو حضرت عیسیٰ کے پیغام میں امن و سکون کی دنیا نظر آئی اور لوگ ان کے مذہب کو ماننے لگے چونکہ مذہب کا حضرت عیسیٰ نے کوئی نام نہیں رکھا تھا۔ اس لئے وہ لوگ جو ان کے پیغام کو قبول کرتے عیسائی کہلائے۔ حواریوں کی کتابیں انجیل کہلائیں۔ یعنی نجات دینے والی کتاب۔

انجیلوں نے یکایک اس دور کے انسان کے مزاج کو بدل دیا۔ وہ قومیں جو بتوں بھیڑیوں۔ جانوروں، سمندروں اور عجیب عجیب شکلوں کے آگے سر جھکا رہی تھیں۔ حضرت عیسیٰؑ کی انجیلوں کے گرد جمع ہوگئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے، شام، لبنان، یونان، یورپ کے ملک اور مصر میں حضرت عیسیٰؑ کا دین پھیل گیا اور مختلف ناموں

سے پکارے جانے والے کروڑوں انسان صرف عیسائی کہکر پہچانے جانے لگے۔

حواریوں کی انجیلیں بہت مختصر ہیں۔ وہ انسانی زندگی کا کوئی جامع دستور بھی نہیں ہیں۔ امن اور نیکی کی زندگی بسر کرنے کے لئے موٹے موٹے اصولوں کا ذکر ہے۔ لیکن ان کا اثر عجیب اور حیرت ناک تھا۔ جس نے آدھی دنیا کو ان کے گرد جمع کر دیا۔

ظاہر ہے کہ جب بت پرست قوموں نے عیسائت قبول کی تو ان کی زندگی کے ہر پہلو پر اس کا اثر پڑا۔ لباس، رسم ورواج، شادی بیاہ کھانا پینا۔ تعلقات و معاملات، عدل وانصاف، صلح اور جنگ سبھی پر انجیلیں اثر انداز ہوئیں۔ اور شام سے لندن تک انسانی زندگی نئے قالب میں نظر آئی۔

جہاں ہم نے انجیلوں کا یہ اثر دیکھا وہاں حضرت عیسیٰ کے چھ سو سال بعد سرزمین عرب پر بھی ایک کتاب نے عجیب وغریب کارنامہ انجام دیا۔

مکہ شہر میں محمد رسول اللہ ﷺ نے ایک کتاب پیش کی۔ توریت اور زبور کی طرح یہ بھی الٰہی کتاب تھی۔ تیئس ۲۳ سال کے اندر یہ کتاب مکمل ہوگئی۔ ریگستان عرب کے بت پرست عربوں کی شدید مخالفتوں کے بعد محمد ﷺ کو رسول اور ان کی لائی ہوئی کتاب قرآن کو اللہ کا کلام تسلیم کر لیا۔

تسلیم ورضا کے اس اعلان کے بعد ڈاکو محافظ بن گئے۔ خونخوار عرب امن وامان کے نگہبان بن گئے۔ چور، زانی، جواری، شرابی تھے - قرآن پڑھا تو ایسے انسان ہوگئے جن پر فرشتوں کو بھی رشک آئے۔ دنیا کی سب سے جاہل اور وحشی قوم میں عربوں کا شمار تھا۔ وہ ایران اور روم کی عظیم الشان حکومتوں کے دست نگر تھے۔ لیکن دس سال بھی نہیں گزرے تھے کہ ایران اور روم کے جھنڈے ان کے قدموں میں گرے پڑے تھے۔ حکومتوں اور ملکوں ہی پر ان کا قبضہ نہیں

ہو گیا تھا۔ دل بھی بدل گئے تھے۔ محکوم قوموں نے بھی قرآن کو قبول کر لیا، عرب شام، مصر ایران اور ترکستان تک کوئی دوسری قوم باقی نہیں تھی۔ سب مسلم، ہو گئے تھے اور قرآن کے دستور کو قبول کر لیا تھا۔

فتوحات کا دور ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ علم کا دور شروع ہو گیا۔ قرآن کے ماننے والوں نے علم کے دریا بہا دئے۔ یونان کا فلسفہ کہیں تہ خانوں میں پڑا تھا۔ اسے نکال کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ ہندوستان کی کتابیں عربی میں ترجمہ ہو گئیں۔ ایران کا علم عربی زبان کی معرفت اسپین (یورپ) تک پہونچ گیا۔ مصر کے کتب خانے کی کتابیں ریگستان سندھ کے شہروں میں پڑھی جانے لگیں۔

قرآن کے کارنامے کے بعد یورپی دنیا علم و تہذیب سے آراستہ ہو گئی قرآن نے دنیا کو انسانی مساوات کا سبق پڑھایا۔ حکمرانی کے طریقے بتائے عدل و انصاف کے لئے عدالتیں قائم کرائیں۔ جبر و ظلم کو روکنے کے طریقے سکھائے۔ معاشیات و عمرانیات کی حدیں مقرر کیں۔ حیا اور بے حیائی کے کاموں میں تفریق پیدا کی۔ نیکی اور بدی کے راستوں کو نمایاں کیا اور ایوبؑ و داؤدؑ و سلیمانؑ کے اس اصول کو عملی شکل دی کہ خوف خدا ہی حکمت ہے اور بدی سے بچنا ہی دانائی۔ اور ہوشمندی ہے۔

افریقہ کے مغربی ساحل سے انڈونیشیا کے مشرقی ساحل تک تمہیں ایک قوم ملے گی جس کا سلام ایک ہو گا۔ عبادت ایک ہو گی۔ رشتے ایک ہوں گے وارثت کے قوانین ایک ہوں گے۔ شادی اور طلاق کا طریقہ ایک ہو گا، حرام و حلال ایک ہوں گے اور اس وحدت کو برقرار رکھنے والی زنجیر اور رسی بھی ایک ہو گی جو تمہیں ہر گھر میں مل جائے گی۔۔ اللہ کی کتاب قرآن حکیم۔

ہم اپنے موضوع کے اعتبار سے قرآن کو ایک ادبی شہ پارہ بھی سمجھتے

ہیں۔ اس کے اندر ادب اور شعریت ہے۔ زورِ بیان اور دلکش اندازِ تحریر نے اسے ایسا دل نشیں بنادیا ہے کہ لاکھوں انسان اِسے اپنے سینوں میں حفظ کئے بیٹھے ہیں۔ نثر کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جسے دنیا کے کسی ایک انسان نے بھی حفظ کیا ہو، قرآن کے سوا۔

ہم کیا کریں کہ علم اور نفسیات کا دعویٰ کرنے والے لوگ کتاب کو چودہ سو سال پرانی کتاب کہہ کر ردّ کر دیتے ہیں- نہیں، وہ کتاب زندہ ہے کیونکہ ایک ارب بیس کروڑ کے قریب انسان اسے ہر روز زندہ کرتے رہتے ہیں، وہ دنیا کے ہر حصے میں روزانہ پانچ وقت پڑھی جاتی ہے اور ایک ارب بیس کروڑ انسان اسے روزمرہ کی زندگی کا دستور العمل بنائے ہوئے ہیں۔

حکومتوں اور ملکوں کے دستور اور قوانین ہیں۔ انہیں ملکوں میں نافذ کیا جاتا ہے ان کی حفاظت کے لئے فوجیں۔ پولیس، ہولناک ہتھیار اور بے رحم عدالتیں ہوتی ہیں۔ کسی انسان کو اجازت نہیں ہے کہ وہ ملکی قوانین، اور قومی دستور کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نکال سکے۔

لیکن ایک کتاب قرآن بھی ہے اس کا بھی دستور ہے۔ اس کے بھی قوانین ہیں۔ اس کی ماننے والی دنیا کی سب سے بڑی قوم ہے لیکن اس کے قوانین پر عمل کرانے کے لئے کبھی فوجیں مقرر نہیں کی گئیں۔ ہتھیار نہیں اٹھائے گئے۔ جس انسان نے اسے قبول کیا اس نے اس دستور و قانون کی حفاظت کا فرض بھی انجام دیا۔

اس طرح قرآن عہد نو کی کتاب ہے جس سے آج بھی حیات انسانی کے لئے امن اور سکون حاصل کیا جاسکتا ہے۔

"شاعری میں مرثئے کی اہمیت"

اردو شاعری میں واقعاتِ کربلا کو بنیاد بنا کر مرثئے کہے گئے ہیں۔ وہ المناک حادثہ جو کربلا میں پیش آیا تھا اور جس میں رسول ﷺ کا خاندان مظالم کا شکار ہوا تھا۔ اور آپ ﷺ کے نواسے حضرت حسینؓ شہید کردئے گئے تھے۔ اردو شاعری کا ایک مستقل عنوان ہے۔

کربلا کے واقعے کے بعد یزید کی اموی حکومت نے ملک پر کنٹرول حاصل کرلیا لیکن جو لوگ اموی حکومت کے مخالف تھے اور کربلا کے مظالم کا انتقام لینا چاہتے تھے انہوں نے کربلا کے ظلم وجور کو بنیاد بنا کر بنی امیہ کے خلاف بغاوت کرنے اور اموی حکومت کو ختم کرکے آل رسول کی حکومت قائم کرنے کے لئے خفیہ تنظیم کی بنیاد ڈالی۔

اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے ضروری تھا کہ واقعات کربلا کا زیادہ سے زیادہ پروپیگنڈہ کیا جاتا اور مسلمانوں کو بار بار اس ظلم وجور کی یاد دہانی کرائی جاتی جو کربلا کے میدان میں خاندان رسالت پر ڈھایا گیا تھا۔

یہ پورا واقعہ حادثہ، سانحہ اور المیہ عربوں سے تعلق رکھتا تھا۔ ایسے تمام حادثوں کو

زندہ اور ان کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے عرب روایات میں شاعری سے کام لیا جاتا تھا۔ عہد جاہلیت میں بھی عرب اپنے مقتولوں کو یاد رکھنے کے لئے شاعری سے کام لیتے تھے۔ عہد رسالت میں شہدائے اسلام کے بارے میں شاعری سے کام لیا گیا ہے۔ اس شاعری کو عربوں نے "مرثیہ" کا نام دیا ہے۔ وہی روایت ہماری اردو شاعری میں بھی مرثیہ کے نام سے زندہ رہی ہے۔ لیکن اردو شاعری میں ہر شخص کی موت پر کہے جانے والے اشعار کو مرثیہ نہیں کہتے، ہماری شاعری میں مرثیہ، واقعاتِ کربلا اور شہدائے کربلا کے سلسلے میں کی جانے والی شاعری کو کہتے ہیں۔

"عربی میں مرثیہ کی روایت" (عہد جاہلیت میں)

محمد رسول اللہ ﷺ کے اعلان نبوت سے پہلے کے زمانے کو عہد جاہلیت کہا جاتا ہے۔ اس زمانے کے شاعروں نے اپنے مقتولوں، اور مرنے والوں کی خصوصیات صفات، شجاعت، مہمان نوازی، غربا پروری اور قبیلے کی پشت پناہی کا ذکر کر کے اظہارِ غم کیا ہے۔

ابن الذبیہ ثقفی نے اہل یمن پر حبشیوں کے حملے اور یمنیوں کی تباہی پر مرثیہ کہا ہے۔ اس جنگ میں یمن کے حاکم ذونواس کو شکست ہو گئی تھی اور وہ سمندر میں ڈوب کر ہلاک ہو گیا تھا۔

اس کا مرثیہ یہ ہے۔

"تیری جان کی قسم، ایک جواں مرد کے لئے کہیں سکون و قرار نہیں،
جس کے پیچھے بڑھاپا بھی لگا ہوا ہے اور موت بھی۔

کیا مقامات عبرت میں صبح کے وقت حمیر کے قبیلے والوں کے ہلاک و برباد ہونے کے بعد بھی کسی کو سکون و قرار کی امید ہے۔

وہ حمیری جن کی تباہی لاکھوں جنگ جوؤں کے ہاتھوں ہوئی جو بارش سے کچھ پہلے چھاجانے والے بادل کی طرح چھاگئے تھے۔

جن کے نعرے اور شور غل نے تھان پر بندھے ہوئے گھوڑوں کو بہرا بنا دیا تھا اور جن سے حمیری مقابلہ کر رہے تھے۔ بدبودار حبشی انہیں بھگا رہے تھے۔ یا ذرہ بکتر کی زیادتی اور اسلحہ کی کثرت سے مرعوب ہو کر وہ خود فرار ہو رہے تھے۔

یہ غولِ بیابانی، شمار میں گرد کے ذرات کی طرح تھا۔ ان کی کثرت سے درختوں کی چھال ختم ہو گئی تھی۔"

رسول اللہ ﷺ کے دادا عبد المطلب کی وفات پر ایک عرب شاعر نے مرثیہ کہا۔ عبد مناف عرف مغیرہ کے بیٹے کا نام ہاشم تھا۔ ہاشم کا انتقال شام کے شہر غمزہ میں ہوا۔ ہاشم کے بیٹے عبد المطلب نے بڑی شہرت حاصل کی انہوں نے یمن کے شہر رومان میں وفات پائی۔

ان کا مرثیہ یہ ہے۔

چھلکتے اور لبریز پیالے پینے کے بعد حاجی عبد المطلب کے مرنے کے بعد پیاسے ہو گئے۔ کاش قریش کسی ایک جھنڈے پر متفق ہو جائیں۔"

مطرود بن کعب خزاعی نے عبد مناف کے بیٹے نوفل اور پوتے المطلب کا مرثیہ کہا۔

"اے سخت راتوں کی ایک رات تو نے بہت سی راتوں کو غم اور پریشانی میں گزارنے پر مجبور کر دیا"۔

اے وائے، وہ غم واندوہ جو میں جھیل رہا ہوں اور اے وہ موتو جن کی تکلیف میں برداشت کر رہا ہوں۔

جب میں اپنے بھائی نوفل کو یاد کرتا اس کی یاد مجھے بہت سے گزرے

ہوؤں کی یاد دلاتی ہے۔

چار شخص ایسے تھے جو سب کے سب سردار تھے اور سرداروں کی اولاد تھے۔ وہ میت جو مقام رومان میں گاڑی گئی (المطلب) اور وہ لاش جو مقام سلمان میں دفن ہے۔ (نوفل) اور وہ جو مقام غزہ میں توپی گئی (ہاشم) اور وہ لاش جو اس لحد میں اتاری گئی جو کعبۃ اللہ کے مشرق میں ہے۔ (عبد شمس) ان سب کا اصل اور ان سب میں ممتاز ہستی تو عبد مناف کعب کی ہے لیکن وہ سب کے سب برائی کرنے والوں کی علامت سے بلند و بالا ہیں۔

بنی جعفرہ اور اس کے قبیلے کے لڑکے زندوں اور مردوں سے بہترین ہیں۔" حضرت صفیہؓ بنت عبد المطلب نے قبول اسلام سے پہلے اپنے باپ کا مرثیہ کہا۔

"میرے آنسو، میرے رخساروں پر ڈھلکنے والے موتیوں کی طرح بہنے لگے۔ اس شریف شخص پر جو دوسروں کے نسب میں ملنے کا جھوٹا دعویدار نہ تھا جسے مخلوق خدا پر نمایا فوقیت حاصل تھی"۔

شیبہ پر جو بڑا فیاض تھا اور بلند مرتبے والا۔ اپنے اچھے باپ پر جو ہر قسم کی سخاوت کرنے والا تھا۔

اس پر جو جنگ کے میدان میں خوب لڑنے والا اپنے ہم سروں سے کسی بات میں پیچھے نہ رہنے والا نہ کم مرتبہ نہ دوسروں کے نسب میں مل جانے والا۔

اس پر جو بہت ہی کشادہ، عجیب حسن و شجاعت والا بھاری بھر کم گھرانے کا قابل تعریف سردار تھا۔

اس پر جو عالی خاندان روشن چہرہ۔ طرح طرح کے فضائل والا۔ قحط سالی میں لوگوں کا فریاد رس۔

اس پر جو اعلیٰ شان والا، ننگ و عار سے بری، سرداروں اور خادموں پر فضل و کرم کرنے والا۔

اس پر جو بڑے علم والا اور سخی لوگوں میں کا ایک فرد دوسروں کا بوجھ اٹھانے والا سردار شیروں کے لئے۔ پشت پناہ تھا۔

اگر کوئی شخص اپنی دیرینہ عزت و شان کے سبب ہمیشہ زندہ رہ سکتا تھا۔ تو وہ اپنی فضیلت و شان اور دیرینہ خاندانی وقار کے سبب زمانے کی انتہا تک زندہ رہتا۔ لیکن ہمیشہ کی زندگی کی طرف تو کوئی راستہ ہی نہیں جاتا۔"

(سیرت ابن ہشام)

عبدالمطلب پر بہت سے مرثیے کہے گئے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔ برّہ بنت عبدالمطلب۔ عاتکہ بنت عبدالمطلب۔ اُمِّ حکیم بنت عبدالمطلب۔ امیہ بنت عبدالمطلب۔ اروئی بنت عبدالمطلب اور دیگر عرب شعراء۔

مرثیہ عہد رسالت میں

قریش نے رسول اللہ ﷺ کو ہجرت پر مجبور کر دیا۔ آپ ﷺ مکہ سے مدنیہ چلے گئے۔ ہجرت کے دوسرے سال بدر کے مقام پر قریش اور رسول اللہ ﷺ کی پہلی جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں قریش کے بڑے بڑے سردار مارے گئے یا گرفتار کر لئے گئے۔ مکہ اور قبائل عرب میں بڑا ماتم کیا گیا۔ لیکن سردارانِ مکہ نے حکم دیا کہ کوئی شخص نہ ماتم کرے گا اور نہ مرثیہ کہے گا۔ کیونکہ اس سے مدینے کے مسلمان خوش ہوں گے۔ اسود بن عبدالمطلب کے دو لڑکے یعنی رسول اللہ ﷺ کے چچیرے بھائی مسلمانوں کی قید میں تھے۔ ایک پوتا بھی قید تھا۔ لڑکوں کے نام زمعہ اور عقیل تھے۔ زمعہ کا لڑکا حارث تھا۔ اسود چیخ کر رونے کے لئے

بچین تھا لیکن قوم کے حکم کی وجہ سے اندر ہی اندر گھٹ رہا تھا۔ ایک رات اس نے کسی عورت کے رونے کی آواز سنی۔ خود اندھا تھا اس لئے کسی سے کہا کہ جا کر معلوم کر، کیا رونے کی اجازت ہو گئی ہے؟ جانے والے نے واپس آکر کہا۔ -ایک عورت رو رہی ہے۔ کیونکہ اس کا اونٹ گم ہو گیا ہے۔

اسود بے چین ہو گیا اور پھر اس نے بدر کے کافر مقتولوں اور قیدیوں پر پہلا مرثیہ کہا۔

-کیا وہ اپنے ایک اونٹ کے کھو جانے پر رو رہی ہے اور بے خوابی اسے نیند آنے سے روک رہی ہے۔؟

اے عورت جوان اونٹ کے کھو جانے پر مت رو بلکہ بدر کے واقعے پر رو جس روز ہماری قسمت پھوٹ گئی۔

بدر پر رو- بنی ھصیص کے بہترین فرزندوں پر رو، بنی مخزوم پر رو اور ابوالولید کی جماعت پر رو۔

اور اگر تجھے رونا ہے تو عقیل۔ پر رو اور حارث پر رو جو شیروں کا شیر تھا۔

اور ان سب پر رو۔ رونے سے کبھی نہ تھک۔ اور ابو حکیمہ کا تو کوئی مدِمقابل ہی نہ تھا۔"

جنگ بدر میں حضرت عبیدہ بن الحارثؓ زخمی ہو کر شہید ہو گئے۔ ان کا مرثیہ حضرت کعب بن مالکؓ انصاری نے کہا۔

-اے آنکھ اپنے آنسوؤں سے سخاوت کر کہ ان کے لئے یہی مناسب ہے اور بخل اور کوتاہی نہ کر۔

ایسے سردار پر جس کی موت نے ہمیں نڈھال کر دیا۔ جو نسب اور جنگی کارناموں کی وجہ سے نہایت شریف تھا۔

پیش قدمی کرنے میں جری، تیز ہتھیار والا، بہترین قوتوں والا، تلاش اور تجربے کے بعد بھی بہترین ثابت ہونے والا۔

عبیدہؓ پر روجو شام کو ایسی حالت میں ہو گیا ہے کہ ہم پر خوش حالی آئے یا بد حالی ہم اس سے کوئی امید نہیں رکھ سکتے، حالانکہ جنگ کی صبح وہ اپنی تلوار سے لشکر کی حمایت میں مصروف تھا۔"

جنگ بدر کی شکست کا انتقام لینے کے لیے قریش نے دوسری لڑائی، مدینہ کے قریب احد کی وادی میں لڑی۔ اس جنگ میں لگ بھگ ستر صحابہؓ شہید ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کو بھی زخم آئے۔ آپ ﷺ کے چچا حضرت حمزہؓ بھی وحشی نام کے ایک حبشی غلام کے نیزے سے شہید ہو گئے۔

حضرت کعب بن مالکؓ انصاری نے حضرت حمزہؓ اور شہدائے اُحد کا مرثیہ کہا۔

- ہماری قوم کے مقتول جنت نعیم میں پہونچے ہیں جہاں آنے جانے کے دروازے بہت ہی خوبصورت ہیں۔

یہ اس لئے جنت میں پہونچے ہیں کہ انہوں نے وادیٔ اُحد میں رسول اللہ ﷺ کے جھنڈے کے نیچے اس وقت صبر واستقلال سے کام لیا جب اوس اور خزرج کے لوگوں نے اور اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے دوسرے صحابہؓ نے اپنی تلواروں سے کفار کا جواب دیا تھا اور یہ سب مسلمان واضح اور روشن حق کی پیروی کر رہے تھے۔

حمزہؓ جب انہوں نے ہڈیوں کو کاٹ دینے والی تیز تلوار سے وفاداری کا حق ادا کر دیا تو بنی نوفل کا وہ غلام (وحشی) ان کے مقابلے پر آیا جو سیاہ اونٹ کی طرح بلبلا رہا تھا۔ اس غلام نے شعلۂ آتش کی مانند نیزہ حضرت حمزہؓ کے سینے پر

پھینک کر مار دیا۔ یہ ایسا شعلہ تھا جو بھڑکتی ہوئی جنگ کی آگ میں بہت زیادہ مشتعل ہو رہا تھا۔"

انہوں نے حق سے منہ نہ موڑا۔ یہاں تک کہ ان کی روح ایک ایسے مقام پر ہونچ گئی جس کے نقش و نگار قابل فخر ہیں۔"

اے کافرو، یہ شہید مسلمان تمہارے ان لوگوں کی طرح نہیں ہیں جنھوں نے جہنم کے اس نچلے حصے میں اپنا ٹھکانا بنایا جہاں چاروں طرف سے بندھے ہوئے ہیں۔"

رسول اللہ ﷺ کا وصال بھی مسلمانوں کے لئے ایک بہت بڑی مصیبت تھا۔ بہت سے لوگ تو اس بات کو ماننے کے لئے تیار ہی نہیں تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا وصال بھی ہو سکتا ہے۔ اس مشترکہ مصیبت کے وقت مسلمانوں نے آپ ﷺ کے وصال پر مرثیے کہے ہیں حضرت حسان بن ثابتؓ کے کئی مرثئے ملتے ہیں۔ حضرت علیؓ نے بھی مرثیہ کہا ہے۔ حضرت حسان بن ثابتؓ کہتے ہیں۔

"تیری آنکھ کو کیا ہو گیا ہے جیسے کہ اسے نیند ہی نہیں آتی۔ اس ہادی و مہدی ﷺ پر آہ و بکا کرنے کی وجہ سے جو اپنے ٹھکانے پر چلا گیا ہے اے وہ ہستی جس نے اس زمین کو چل کر بار بار روندہ ہے مجھ سے دور نہ ہو۔

میرا چہرہ آپ ﷺ کو مٹی سے بچائے۔ افسوس، کاش میں آپ ﷺ سے پہلے ہی جنت البقیع میں دفن کر دیا گیا ہوتا۔

اس ہدایت یافتہ نبی پر میرے ماں باپ قربان جس کی وفات دو شنبہ کو میرے سامنے ہو گئی۔ اس لئے اب میں آپ ﷺ کی وفات کے بعد حیران و ششدر رہوں اور ادھر ادھر دیکھتا پھرتا ہوں۔ اے کاش میں پیدا ہی نہ ہوتا۔

کیا میں آپ ﷺ کے بغیر مدینہ میں لوگوں کے درمیان رہ سکوں گا۔

اے کاش صبح صبح کالے ناگوں کا زہر پلا دیا گیا ہوتا۔

یا آج کی شام یا کل کی شام اللہ کا حکم میرے لئے نازل ہو جائے۔ پھر ہمارا وقت آجائے اور ہم اس پاک وطیب ہستی سے جا کر مل جائیں جس کی فطرت خالص اور جس کی اصل شریف ہے۔"

رسول اللہ ﷺ کی پیاری بیٹی حضرت فاطمہؓ کی وفات پر ان کے شوہر حضرت علیؓ نے مرثیہ کہا۔

"میں دیکھتا ہوں کہ دنیا کی بیماریوں اور مصائب نے مجھے چاروں طرف سے آگھیرا ہے۔

ہر ملاقات کے بعد دوستوں میں جدائی ضروری ہے۔ اور وہ زمانہ جو جدائی کے بعد ہوتا ہے وہ مختصر ہوتا ہے۔ احمد ﷺ کے بعد فاطمہؓ کی مفارقت اس بات کی دلیل ہے کہ دوست ہمیشہ نہیں رہتا۔"

حضرت فاطمہ زہرہؓ نے رسول اللہ ﷺ کی وفات پر مرثیہ کہا۔ "جو شخص احمد کی تربت کی مٹی ایک بار سونگھ لے اس پر لازم ہے کہ پھر کبھی خوشبو نہ سونگھے۔

مجھ پر اتنی مصیبتیں پڑی ہیں کہ اگر دنوں پر پڑتیں تو وہ راتوں میں تبدیل ہو جاتے۔ افق غبار آلود ہو گیا۔ سورج لپیٹ دیا گیا۔ اور زمانہ تاریک ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد زمین غمگین وحزین ہو گئی۔ چاہے آپ مشرق و مغرب کے رہنے والے ہوں، چاہے اہل مصر اور اہل یمن۔ سب کو چاہئے کہ آپ ﷺ کی وفات پر آنسو بہائیں

اے ختم رسل جس پر قرآن اترا تھا۔ آپ ﷺ پر اللہ کی رحمت نازل ہو۔"

اس طرح عہد جاہلیت کے مرثیہ کی ادبی روایت، عہد رسالت میں

بر قرار رہی اور رسول اکرم ﷺ کے وصال کے بعد بر قرار رہی۔

(تمام حوالے سیرت ابن ہشام سے ماخوذ ہیں۔
صرف حضرت علیؓ کا مرثیہ، عبدالروف عروج کی
کتاب-اردو مرثیہ کے پانسو سال سے لیا گیا ہے)

وصال نبویؐ کے بعد تاریخ اسلام میں کربلا کا اہم واقعہ پیش آیا۔ ایسا واقعہ جس نے پوری دنیائے اسلام کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور پچھلے چودہ سو سال میں اس کی اہمیت کبھی کم نہیں ہوئی ہے۔ اس واقعہ سے مسلمانوں کی سیاسی اور مذہبی زندگی پر بھی گہرا اثر پڑا۔ کربلا کے نام پر کتنی ہی تحریکیں چلائی گئیں اور کتنی ہی حکومتیں بنتی اور بگڑتی رہیں۔

اس وقت میرا موضوع اردو شاعری میں مرثیہ کی اہمیت پر ایک نظر ڈالنا ہے۔ اس اہمیت پر جس کا تعلق صرف شاعری سے ہے۔

اردو میں مرثیہ نگاری

اردو عربوں کی زبان نہیں ہے۔ ایرانیوں ترکوں اور افغانوں کی بھی زبان نہیں ہے۔ یہ قومیں مشترکہ مذہب اسلام کی ماننے والی تھیں لیکن ان کی زبان ایک نہیں تھی۔ ان کے اپنے قومی مراسم بھی الگ الگ تھے۔ جنھیں اسلام نے صرف اس حد تک روک دیا تھا جس سے شرک اور کفر اور بداخلاقی کا تعلق تھا۔

یہ زبانیں اور ان کے ساتھ ہندوستان کی مقامی زبانیں سب ملکر ہندوستان کی انتظامیہ اور قومی حکومت کی ضرورت بن گئیں۔ یہاں غلام خاندان کی ہندوستانی حکومت میں حکمراں طبقے کا تعلق ترکوں اور افغانوں سے تھا۔ افغانوں کا وہ علاقہ جو فارسی بولتا تھا غلام خاندان میں اہمیت رکھتا تھا۔ حکومت کی

روزمرہ کی زبان ترکی اور فارسی سے ملی جلی زبان تھی۔ فارسی غالب تھی لیکن روز مرہ کے استعمال میں ترکی کے ہزاروں الفاظ فارسی میں شامل ہوتے چلے جا رہے تھے۔ ساتھ ہی مذہبی تقاریب اور عبادات کے سلسلے سے عربی کے الفاظ اور تراکیب بھی روزمرہ کی زندگی کا جز بن گئے تھے۔

حکومت کے ساتھ ہندوستان میں رہنے والوں کو بھی حکمراں طبقے میں شامل ہونے کا موقع ملا۔ انتظامیہ اور فوجی زندگی میں مقامی زبانیں جاننے والے ہندوستانی بھی داخل ہوئے۔ اس طرح اعلیٰ طبقے میں ترکی، فارسی، عربی اور ہندوستانی مقامی بولیوں کا اتصال ہوا۔ بنیادی طور پر ادبی زبان فارسی رہی لیکن بازار اور ضرورت کی زبان ایسی بن گئی جس کا سمجھنا کسی خالص ایرانی کے لئے مشکل تھا۔ یہی زمانہ ہے جب فارسی ادیبوں نے یہ فیصلہ دے دیا تھا کہ ہندوستان کے فارسی داں فارسی زبان کے طفل مکتب ہی سمجھے جا سکتے ہیں، ان کی ادبی اہمیت کو (فارسی میں) تسلیم کرنے کے لئے سخندان فارس تیار نہیں تھے۔ سبب یہی تھا کہ ہندوستانی فارسی کا چہرہ اتنا بدل گیا تھا کہ ایرانی اسے پہچاننے میں دقت محسوس کرتے تھے۔

یہ بدلتا ہوا چہرہ جب افغانی سرداروں سے اور دور ہٹا اور تازہ دم فارسی اور ترکی اور پشتو اور پنجابی زبان کے ادیبوں اور زبان دانوں سے دور ہو کر ہندوستان کے جنوبی اور مشرقی علاقوں میں چلا گیا تو فارسی، ترکی اور پشتو اور شمالی ہندوستان کی مقامی بولیوں کے الفاظ اور تراکیب کا اثر اور کم ہوتا چلا گیا۔ جنوب میں دکھنی زبانوں نے شمالی ہند کی زبان پر دھاوا بولا اور پورب میں اودھ بہار اور بنگال کی زبانوں کا غلبہ ہوا۔ ادبی تاریخ میں یہ نئی زبان کب لکھی گئی اگر اس کا تعین ہو سکے تو ہم اس کا نام اردو رکھ کر اردو کی صحیح تاریخ لکھ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ محمد

بن قاسم کے ساتھ آنے والی عربی سے ہندوستان کی سندھی اور راجستھانی اور کشمیری کا پہلا اتصال ۹۳ھ سے شروع ہو گیا تھا۔ لیکن اس طرح عربی کی جو صورت بگڑی تھی وہ بول چال سے آگے بڑھ کر تحریر میں نہیں آئی اور جب تک کوئی زبان تحریر میں نہیں آتی اس وقت تک اس کی کوئی تاریخ نہیں ہوتی۔

یہ بولی جانے والی غیرعربی اور غیر ہندوستانی زبان ۱۰۰۸ء ۳۹۹ھ سے محمود غزنوی کے آخری حملے تک ملتان سے راجستھان کی سرحدوں تک بولی جاتی رہی ہو گی۔ لیکن غزنوی کے حملوں کے بعد نئی زبانیں -ترکی پشتو، فارسی اور عربی کادائرہ بہت وسیع ہو گیا۔ وہ کشمیر سے ہوتی ہوئی۔ موجودہ ہماچل پردیش سے اتر کر متھرا کے پاس سے سیدھی کالنجر سے دہلی ہو کر گجرات کے شہر سومناتھ تک جاکر سیدھی شمال میں پنجاب ہو کر غزنی چلی جاتی ہیں۔

غزنوی کے حملے کے بعد ایک سو سال تک یہ زبان لاہور کے ذریعہ سے شمالی ہندستان میں ترسیل ہوتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ شہاب الدین غوری کے فارسی اور پشتو بولنے والے سپاہی لاہور سے آگے نکل جاتے ہیں اور تیر کی طرح راجستھان میں اجمیر تک اور اجمیر سے قنوج' لکھنؤ اور متھرا ہوتے ہوئے دہلی کو مرکز بنالیتے ہیں۔ (۱۱۹۲ سے ۱۱۹۴ء تک)

غوری کے بعد اس کے غلام جانشین قطب الدین ایبک نے دہلی کو ہندوستان کی پہلی راجدھانی بنا کر جنوب میں رائے سین تک اور مشرق میں بنگال تک اپنی حکومت اور زبان کو پھیلادیا۔

اس پورے دور میں تمام دیسی اور بدیسی زبانیں ایک دوسرے میں شامل ہوتی رہیں۔ بازاروں اور روزمرہ کی ضرورتوں میں مشترکہ زبان اپنا فرض انجام دیتی رہی لیکن تحریریاادب یادربار یا عبادت میں اس کو کوئی جگہ نہیں ملی تھی۔

اسی زبان کو ہم تحریری صورت میں سب سے پہلے دکن میں دیکھتے ہیں۔ یہ فارسی رسم الخط میں لکھی گئی اور اس کے لئے اس دور کی سبھی زبانوں کے اصلی اور بگڑے ہوئے الفاظ ملا کر ایک زبان بنائی گئی۔ اور اس زبان کا نام ''دکنی'' رکھا گیا۔ یہ زبان دکن کے سبھی باشندے بولتے تھے۔ اور خیال کا یہی ذریعہ بن گئی تھی۔ مقامی زبانیں بھی زندہ رہیں کیونکہ انہیں فنا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ لیکن مشترکہ زبان دکنی سبھی کے اظہار خیال اور آپسی لین دین کا ذریعہ تھی۔

ہمارے موضوع کی مناسبت سے یہ بات بہت اہم ہے کہ جیسے ہی اس نئی زبان نے آنکھیں کھولیں اور اس بچی کی زبان پھوٹی اس نے مرثیہ کو اپنا موضوع بنالیا۔ ہمارے پاس سب سے پہلا مرثیہ ایک نظم کی صورت میں موجود ہے۔ جو اشرفؔ نے بہمنی حکومت کے زمانے میں ''مثنوی نوسرہار'' کے نام سے ۱۵۰۳ء میں کہی ہے۔ یہ واقعات کربلا پر ایک نظم ہے لیکن ہم مرثیہ کی تعریف میں جس کلام کا ذکر کر سکتے ہیں وہ گول کنڈہ کے حکمراں محمد قلی قطب شاہ (۱۵۵۰ء) کا دیوان ہے جس میں واقعاتِ کربلا پر براہ راست مرثیے لکھے گئے ہیں۔ اس وقت دکنی زبان جو اردو کی ابتدائی تحریری زبان ہے اس طرح بولی اور لکھی جاتی تھی۔

قلی قطب شاہ کے مرثیے کا نمونہ۔

''دو جگ'' اماماں دُکھ تے، سب جیو کرتے زاری ہائے ہائے۔
تن روں کی کڑیاں جان کر کرتی ہیں خواری ہائے ہائے۔

اسی دور میں دوسرے شاعر ملاوجہی دکنی ہیں، لکھتے ہیں۔

''حسین کا غم کرو عزیزاں رنجو میں سوں جھڑ دعزیزاں
بنا جو اوّل غم کا عرش لگن، مہور دھرت ہلایا''

خواصؔی دکنی نے لکھا۔

دستانیں کروں کیا بیاں کربلا کا — پھرتا ہوں، زار ہوں میں حیراں کربلا کا
خواصیا، معطر عالم کو سب کیا ہے — گویا یہ مرثیہ ہے ایمان کربلا کا

نصرتی لکھتا ہے۔

یہ ساقی کوثر اہے جنت کی طرف رہبرا ہے — داماد پیمبرا ہے، ہوا نرسوں شہ نار کا
رونا مور خیر النساء، خاتونِ جنت فاطمہ — ہرحورجس خدمت کرے لے بھیں خدمت گار کا

قطب شاہ وجہیؔ، خواصؔی، نصرتی اور ان کے دوسرے ہم عصر شعراء کا زمانہ ۱۰۰۱ھ سے ۱۱۰۰ ہجری تک ہے لیکن جب ہم ۱۱۰۱ھ کے بعد کے دکنی شعراء کے مرثیوں کی زبان دیکھتے ہیں تو وہ ترقی یافتہ اردو کی طرف کئی قدم آگے بڑھ چکی ہے۔ اس دور کے چند مشہور شعراء کے مرثیوں کی زبان دیکھئے۔

امامؔی دکنی کہتے ہیں

محشر میں جب محمد شاہِ زمن اٹھیں گے — سب انبیائے مرسل پر غم حزن اٹھیں گے
حیدر علی لہو سو آلود تن اٹھیں گے — بہتے لہو کی ہلکاں ہے ہے حسن اٹھیں گے

ہاشم علی کہتے ہیں۔

آج پر خون کفن ترا اصغر — آج سوکھا دہن ترا اصغر
لال ہے گل بدن ترا اصغر — حیف یوبال پن ترا اصغر

رضؔی دکنی نے لکھا ہے۔

غم سوں ہے بیقرار میرا دل — دکھ سوں ہے زارزار میرا دل
گرد غم سوں امام کے اے رضؔی — کیوں نہ ہو پُر غبار میرا دل

روحی دکنی لکھتے ہیں۔

آج غمناک ہیں چمن کے پھول — بلکہ دل چاک ہیں سمن کے پھول

نقشِ پا دیکھ دل ہوس رکھتا　　سر پہ رکھنے کو تجھ چرن کے پھول

شاہ آیت اللہ جوہری دکنی نے لکھا۔

لوٹ لیا بنجارہ بن میں　　ٹانڈر لدا ہوا سارا بن میں
ہائے حسینا پیارا بن میں　　بیکس کر کے مارا بن میں
بن بن کھڑی بنجاری روئے　　گھر جو لٹا گھر باری روئے
بانو، بہو بیچاری روئے　　راول جس کا سارا بن میں

تاجی دکنی نے زبان کو اور صاف کیا ہے لکھا ہے۔

اللہ ثنا خوانِ حسینؓ ابن علیؓ ہے　　قرآن میں خود شانِ حسین ابن علی ہے

اسی صدی میں ولی دکنی اورنگ آبادی اپنی اردو کی شاعرانہ عظمت کے ساتھ دلی پہونچے، وہ واقعات کربلا کو اس زبان میں پیش کر رہے تھے۔

ہر ایک رنگ میں دیکھا ہوں چرخ کے نیرنگ　　ہوا ہوں غنچہ صفت جگ کے باغ میں دل تنگ
اسی کی آن پہ رت ہے ولی بلا گردوں　　کیا چراغ پہ اس کے مدام جی کو پتنگ

دہلی میں اس وقت اردو کا راج تھا لیکن دربار شاہی پر فارسی حکمراں تھی۔ ولی نے اپنی زبان۔ اپنی شاعری اور اپنا انداز بیان دہلی کے اہل علم کے سامنے پیش کیا تو فارسی میں طبع آزمائی کرنے والے ان شعراء کو بھی اردو میں شعر کہنے کی خواہش ہوئی، جو ابھی تک اردو میں شعر کہنا کسر شان سمجھتے تھے۔

دہلی کے پہلے اردو شاعروں نے بھی مرثیے کو اپنا موضوع بنایا، یہ تھے مصطفےٰ خاں یکرنگ شاہ حاتم، شاہ مبارک آبرو، خواجہ برہان الدین عاصی امامی میر محمد بیمار اور علی نقی قدیم وغیرہ

شمال میں اردو شاعری کا غلغلہ بلند ہوا تو زبان کی صفائی کے ساتھ مرثیے کے موضوع اور انداز بیان کے لئے بھی نئی راہیں نکالی گئیں۔ سکندر، گدا مسکین،

حزیں، احسان وغیرہ نے نئے نئے طرز پر مرثیے کہے۔

پھر اردو زبان کی نوک پلک درست کرنے اور زبان کو سنوار کر فارسی اور دوسری ہندوستانی زبان کی جگہ لینے والی ایک قومی زبان بنانے والے استادوں اور معماروں کا دوسرا دور شروع ہوا۔ ان معماروں نے زبان کے ساتھ مرثیے کے موضوع کو بھی سنوارا۔ سودا نے مسدس میں مرثیہ کہنا شروع کیا اور ناسخ، میر، مصحفی، جرأت، غلام حسین ضاحک اور فقیر محمد خان گویا نے مرثیے کے موضوع کو وسعت عطا کی۔ ان استادوں کی سنواری اور آراستہ کی ہوئی اردو اور مرثیے کی زمین کو یکایک لکھنؤ کے مرثیہ گو شعراء نے آسمان بنادیا۔ میاں دلگیر۔ میر ضمیر، مرزا فصیح، میر خلیق اور میر حسن نے مرثیے کو جو نیا رنگ دیا تھا اسے میر انیس اور مرزا دبیر نے اردو شاعری کے گلستان میں ایک خوشنما اور ہر طرح سے آراستہ چمن میں تبدیل کردیا۔ یہاں اردو زبان نے اظہار خیال کی طاقت میں دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں کو مقابلے کی دعوت دی اور یونان کی رزمیہ شاعری سے لیکر شاہ نامہ فردوسی، مہابھارت اور رامائن کی حریف بن کر کھڑی ہوگئی۔

میر خلیق و ضمیر کا نام مرثیہ نگاری میں ہمیشہ یادگار رہے گا، ان عظیم شاعروں نے مرثیے کو ایک نیا اور تاریخی موڑ دیا اور مرثیے کے اجزائے ترکیبی کا آغاز کیا، جس نے مرثیے کی خوبیوں کو تواتر کے ساتھ ابھرنے کا موقع فراہم کیا۔

اجزائے ترکیبی میں چہرہ، رخصت، رجز، رزم، وصف نگاری، شہادت اور بین کو شامل کیا جاتا ہے۔

سراپا یا چہرہ:- مرثیے کی ابتداء میں شاعر، باغ کی بہار، صبح کا بیان، منظر نگاری، دریا کی روانی، سبزے کی لہلہاہٹ، پھولوں کی خوشبو، گرمی کا بیان، جاڑے کی ٹھنڈک نسیم سحری کے جھونکے، جھرنوں کی مترنم آوازیں وغیرہ کا بیان کرتا ہے۔

رخصت:- مرثیے کی اس منزل میں مقابل اپنے حریف سے مقابلہ کرنے

جاتے وقت بزرگوں سے اجازت لیتا ہے۔

رجز:- اس مقام پر سپاہی اپنے بزرگوں کی عظمت اور اپنی خاندانی شجاعت بیان کرتا ہے تاکہ دشمن مشتعل ہو کر خوفزدہ ہو جائے۔

رزم:- یہاں شاعر میدانِ جنگ کی منظر کشی کرتا ہے۔

وصف نگاری:- وصف نگاری میں شاعر تلوار اور گھوڑے کی تعریف میں اشعار کہتا ہے۔

شہادت:- یہاں شہید کی خصوصیات اس کی پریشانیاں اور مصائب بیان کئے جاتے ہیں

بین:- بین مرثیے کا سب سے اہم حصہ ہے۔ اس میں شہدائے کربلا کے مصائب بیان کر کے سامعین و قارئین کو رلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اتنی اصلاح و ترقی کے بعد مرثیہ ایک موضوع نہیں رہا بلکہ ایک دبستان ہو گیا جس کے اندر سیکڑوں انداز سے آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ غروب ہو رہا تھا۔ پانی بند تھا، بہہ رہا تھا۔ موجیں مار رہا تھا۔ پانی پانی ہو رہا تھا۔ صحرا کی تپتی ہوئی دوپہر تھی راتوں کی پر کیف ہوا تھی۔ سہرے بندھ رہے تھے، مہندی لگ رہی تھی، خون کے دریا بہہ رہے تھے۔ تلوار اپنے جوہر دکھا رہی تھی۔ گھوڑے ٹاپیں مار رہے تھے۔ تیر سنسنا رہے تھے نیزے چمک رہے تھے۔ زرہ پارہ پارہ ہو رہی تھی۔ خود کٹ کر گر رہے تھے۔ زندگی کی کوئی قیمت نہ تھی۔ زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ جیداری اور شجاعت تھی، صبر اور تسلیم ورضا تھی، رزم کے لرزہ دینے والے مناظر تھے۔ بزم کے سکون قلب عطا کرنے والے کردار تھے۔ یعنی مرگ وحیات وکائنات کے تمام مسائل کو مرثیے نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا تھا۔

زبان اور مرثیے کی اس بلندی پر اردو زبان کو ناز تھا، مگر انیسؔ اور دبیرؔ کی زبان اور واقعات کربلا کو بیان کرنے کے بے مثال انداز ہی کو معیار بنایا جائے تو

اردو زبان دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان کے مقابلے میں پیش کی جاسکتی ہے۔—— لیکن آسمان ادب پر ایک نیا ستارہ طلوع ہوا اور دنیا نے اسے جوشؔ ملیح آبادی کے نام سے پہچانا۔ اس شاعر رومان نے شاعری کی ابتداء کی تو مرثیے کو روح ثریا عطا کرنے کے لیے قلم اٹھایا۔ اب مرثیہ واقعات کی حدوں کو توڑ کر انقلاب اور عمل کی حدوں میں داخل ہو گیا۔ جوشؔ نے مرثیے کو ایک پیغام بنا کر پیش کیا۔ انہوں نے ہر محبّ اہل بیت اور کلمہ گو کو حسین بن کر عصر حاضر کے یزیدوں پر ٹوٹ پڑنے کے لئے للکارا۔ حضرت حسینؓ کے پیغام کو ہر مسلمان کے دل میں اتار دینے کے لیے انہوں نے اپنے عنفوان شباب میں بھی مرثیہ کہا اور اپنی شام زندگی کے آخری ایام (۱۹۸۲ء) میں بھی مرثیہ کو اپنے پیغام اور نظریات کی اشاعت کا ذریعہ بنایا۔

وہ مرثیہ جو اشرفؔ دکنی کی "نو سر ہار" سے یا عبد اللہ قطب شاہ کے دیوان ۱۵۵۰ء سے شروع ہوا تھا۔ ۱۹۸۲ء میں جوشؔ ملیح آبادی کی وفات کے وقت اپنے عروج پر ضرور نظر آتا ہے۔ لیکن ہم نہیں کہہ سکتے کہ ارتقاء کا یہ دور کب ختم ہوگا جوشؔ کے بعد اردو شاعری اور مرثیے کا میدان بہ ظاہر خالی ہے لیکن انسانی زندگی کے ارتقائی عمل کی طرح زبان اور شاعری کا ارتقائی عمل بھی بند نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ "ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں"

(جناب مائلؔ ملیح آبادی کے ایک مضمون سے استفادہ)

کیا اردو ادب رو بہ زوال ہے؟

موجودہ اردو ادب اپنی ترقی پسندانہ روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہے یا اس سے پیچھے ہٹ رہا ہے۔؟ اس سوال کا جواب دینا بہت زیادہ آسان نہیں ہے، اگر آسان بھی ہو تو موجودہ ادیب اس جواب سے مطمئن نہیں ہوں گے۔ فیصلہ دینے کا اختیار کسی کو حاصل نہیں ہے۔ ادب کی مسند پر ان لوگوں کا قبضہ ہے جو ادب سے رزق اور شہرت حاصل کرنے کے قائل ہیں۔

ان حالات میں صرف خیالات کا اظہار ہی کیا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے اردو کے نئے ادیب اس رائے سے متفق ہوں اور ان کا قلم اظہار حقیقت کی جرأت کر سکے۔ وہ اپنے گردوپیش سے سبق حاصل کر کے اصلاح اور ترقی کی کوشش کریں کیونکہ ادیب اپنے گردوپیش کو فراموش نہیں کرسکتا اور اس طاقت کو بھی فراموش نہیں کرسکتا جو گردوپیش کے حالات پیدا کرنے کی ذمہ دار ہے۔ وہ طاقت حکومت ہے۔

اس طرح ادیب اور حکومت کے درمیان یا تو بہترین تعلقات ہونگے یا

بدترین جنگ۔ بے تعلقی بے معنی چیز ہے اور جو لوگ بے تعلقی کا دعویٰ کرتے ہیں وہ ادیب نہیں۔ دربارِ شاہی کے ثناخواں ہیں۔

اردو ادب کی شاندار روایات ہیں، یہ حقیقت ہے کہ وہ کسی دور میں بھی اپنے گرد و پیش سے بے تعلق نہیں رہا اور اسی تعلق کی بنا پر اس نے ہمیشہ اپنے دور کے نظام حکومت کے خلاف تنقید بھی کی اور اصلاح کی خواہش بھی رکھی۔

ہم بہت پیچھے نہ جا کر اس دور کو لیں گے جب اردو کو سرکاری یا ادبی زبان کا منصب حاصل نہیں ہوا تھا۔

۱۷۶۱ء میں نادر شاہ افشار نے دہلی میں قتل عام کیا تھا وہ تخت طاؤس ایران لے گیا تھا۔ اس قتل عام کرنے والے نادر کے خلاف ایک شاعر میر عبدالحیٔ تاباںؔ نے ایک غضب کا شعر کہا ہے۔

"داغ ہے ہاتھ سے نادر کے مرا دل تاباںؔ
نہیں مقدور کہ جا چھین لوں تختِ طاؤس"

ہندوستانی فوجیں شکست کھا چکی تھیں، دہلی قتل ہو چکی تھی، بادشاہ محمد شاہ لال قلعے میں منہ چھپائے بیٹھے تھے، ان کے اجداد کا تختِ طاؤس نادر لوٹے لئے جا رہا تھا۔ لیکن کسی گوشے میں پڑا ہوا، دہلی کا سب سے حسین بے حقیقت شاعر اپنے ملک کے تخت کو لٹتے ہوئے دیکھ کر نہ قتل عام کرنے والے نادر سے ڈرتا ہے اور نہ اپنے کمزور بادشاہ سے وہ اپنی بے کسی پر خون کے آنسو بہا کر کہتا ہے۔

"نہیں مقدور کہ جا چھین لوں تختِ طاؤس"

تختِ طاؤس کے چھن جانے کے بعد سے انقلابات کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ حکومت میں ابتری آتی ہے۔ معاشی دشواریاں پیدا ہوتی ہیں، جب بادشاہ کمزور ہو جاتا ہے تو اس کے ماتحت جبر و ظلم پر اتر آتے ہیں۔ انصاف رخصت

ہو جاتا ہے عوام ایک طرف معاشی مصیبتوں میں گرفتار ہوتے ہیں اور دوسری طرف سماجی ظلم وستم کا شکار بننے لگتے ہیں۔

اردو ادب اور شاعری کی ترقی کا زمانہ وہی ہے جو حکومت مغلیہ کے زوال کا زمانہ ہے۔ اپنے گردو پیش کے حالات بیان کرنے کے لئے اس دور میں اردو نے "شہر آشوب" کا سہارا لیا۔

شہر آشوب اپنے دور کے سماجی سیاسی اور معاشی حالات کا آئینہ ہے۔ اس دور کی تباہ حالی اور ابتری کے اظہار کے لئے "شہر آشوب" بہترین عنوان تھا۔ جس میں دہلی کی عظیم حکومت کے زوال کی پوری تاریخ بولتی ہوئی تاریخ درج ہے۔

یہ بہت لمبا زمانہ ہے۔ جبر و ظلم کی جو مشین عہد مغلیہ کے آخری سو سال میں چلتی رہتی تھی وہ انگریزوں کے زمانے میں اور تیزی کے ساتھ عوام کا قتل عام کرنے لگی۔ دیسی اور بدیسی دونوں ہی عوام کو لوٹنے لگے۔ رفتہ رفتہ جاگیر داری کمزور ہوتی گئی اور سرمایہ داری طاقت حاصل کرتی رہی، انگریز نے ملکی جاگیر داری اور سرمایہ داروں کو اپنا رفیق بنا کر عوام کی زندگی عذاب بنادی۔

پھر انگریزی اقتدار کا خاتمہ ہو گیا اور ہندوستانی سرمایہ داری نے دہلی کا تخت حاصل کر لیا۔ اس نے ایک طرف جاگیر داری کو ختم کر کے کچے مال کی پیداوار کا راستہ صاف کیا اور دوسری طرف کچے مال کو صنعت میں استعمال کر کے عوام کو کمر توڑ مہنگامی کے چکر میں ڈال دیا۔

سرمایہ دارانہ حکومتیں عوام کے خلاف سخت جابرانہ قوانین کا سہارا لیتی ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس حکمرانی کی پچھلی روایات بھی نہیں ہیں۔ سرمایہ داری عوام کے جسم پر بھی حکومت کرتی ہے۔ اور ذہن پر بھی۔

یہ لمبا زمانہ حکومت اور ادیب کی جنگ کا بھی زمانہ ہے۔ اردو ادب کی تاریخ یہی ہے کہ وہ مسلسل اس جبر و ظلم کے خلاف جنگ کرتا رہا ہے جن ادیبوں نے جابر حکومتوں سے صلح کر لی ان کی ذہنی صلاحیتیں مرگئیں اور وہ بساطِ ادب سے اُٹھا کر پھینک دئے گئے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جہاں مجاہدوں اور سپاہیوں نے شمشیر و سناں کے جوہر دکھائے، وہاں شاعروں اور ادیبوں نے بھی نوکِ قلم سے انگریزوں کے خلاف آتش بغاوت کو بھڑکانے کا فرض انجام دیا۔ کتنے ہی اخبار نویس، شاعر، ادیب اور اہلِ قلم تھے جو انگریزوں کی سفاکیوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔

۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد انگریزوں کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ انہوں نے ہندوستان کو اپنے آہنی پنجے میں جکڑ لیا۔ کتنے ہی اہل قلم تھے جو انگریز کے در پر سجدے میں گر گئے۔ لیکن کتنے ہی ادیب اور شاعر تھے جو مختلف صورتوں میں اپنے غم و غصے کا اظہار کرتے رہے۔

جب ہندوستانی قوم نے پھر سنبھالا لیا اور نئی بنیادوں پر ۱۸۵۷ء کے مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش شروع کی تو اردو ادب نے پھر اپنی روایتی بیباکی کے ساتھ قلم سنبھالا۔

۱۹۱۲ء کے لگ بھگ کلکتے سے مولانا ابوالکلامؒ آزاد اور مولانا عبد الرزاقؒ ملیح آبادی نے نئی ادبی زندگی کی داغ بیل ڈالی۔ الہلال اور البلاغ کے نام سے ہفت روزہ رسالے نکال کر ذہنی آزادی اور ادبی ذمہ داری کی ایک نئی شاہراہ پیدا کی۔

دیکھتے ہی دیکھتے اردو ادب جنگ آزادی کا نقیب بن گیا۔ مولانا محمد علیؒ جوہر مولانا عبد الرزاقؒ ملیح آبادی، حسرتؒ موہانی، ظفر علی خانؒ، عبید اللہ سندھیؒ، اقبالؒ اور جوشؔ کے ایسے بیباک اہل قلم نے غیر ملکی حکومت کے خلاف اظہارِ نفرت کے

نئے نئے انداز اختیار کئے۔اردو زبان سے فیض حاصل کرنے والے لاکھوں کروروں انسانوں نے ان اہل علم کی آواز پر لبیک کہی۔پورا ملک انہیں کے نقش قدم پر چلنے لگا۔

ظاہر ہے کہ انگریزی حکومت نے ان کے ادب کو پسند نہیں کیا،ان کی جابرانہ مشین حرکت میں آئی۔ادیبوں اور شاعروں نے ہر طرح کی مصیبت کو برداشت کیا۔

قید وبند کے علاوہ ان کی معاشیات پر بھی پابندیاں لگ گئیں سرکاری نوکریوں سے وہی بے دخل نہیں ہوئے۔ان کی نسل کو بھی نااہل قرار دے دیا گیا۔اس طرح ان کے خلاف براہ راست بھی حملہ کیا گیااور بغل سے بھی۔

اردو اہل قلم کے انداز میں نمایاں فرق رہاہے لیکن مقصد میں بہت زیادہ فرق نہیں رہا۔سبھی اپنے گردوپیش کے حالات کو غلامی کی پیداوار سمجھتے تھے غلامی کا ذمہ دار انگریز تھا۔جب تک اس کی حکومت موجود تھی ادیب اور شاعر آزادی میں سانس نہیں لے سکتا تھا۔اسکی تخلیق کا مقصد یہی تھاکہ غیرملکی حکومت کا خاتمہ ہو۔قومی حکومت وجود میں آئے اور اہل علم کو وہ سازگار ماحول میسر ہو جس میں ان کی تخلیقات کی قدر کی جائے۔اور عوام ادب کی حقیقی مسرت حاصل کر سکیں۔

ادیب پر ہمیشہ پابندیاں لگی رہی ہیں۔انگریزوں نے تحریر و تقریر کے بارے میں باقاعدے قانون بنائے تاکہ ادیبوں کو آسانی کے ساتھ سزادے کر ادب کی شاندار تخلیق سے روکا جاسکے۔اقبال ان پابندیوں سے گھبرا کر چیخ اٹھے۔

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

اکبر الہ آبادی نے ۱۹۰۱ء میں ایڈورڈ ہفتم کی تاج پوشی کا جشن دہلی میں

دیکھا اور کہا۔

پہونچے پھاند کے سات سمندر
تحت میں ان کے بیسیوں بندر
محفل ان کی- ساقی ان کا
آنکھیں میری، باقی ان کا

اقبالؔ نے اہل ہند کو آگاہی دی۔

رلاتا ہے تیرا نظارہ اے ہندوستان مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ، سب فسانوں میں
چھپا کر آستیں میں، بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستان والوں
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

آزادئ تحریر پر جو پابندیاں لگی ہوئی تھیں، ان کے بارے میں کہتے ہیں۔

سکوت آمیز طول داستان درد ہے ورنہ
زبان بھی ہے ہمارے منہ میں اور تابِ سخن بھی ہے۔

اس دور میں اقبالؔ، حسرتؔ، ظفر علی خان مولانا محمد علی جوہر اور جوش ادب کے نمائندے نظر آتے ہیں اور یہ سب ادیب اور شاعر اپنی تحریر اور شاعری سے غیر ملکی حکومت کے خلاف صف آرا رہے۔

حسرتؔ موہانی، ظفر علی خان، اور مولانا محمد علی جوہر کی سیاسی حیثیت بھی تھی اس لیے انہیں بار بار جیل کے مصائب بھی برداشت کرنا پڑے۔

اقبال کی عالمانہ ضرب شدید کے ساتھ ساتھ جوشؔ ملیح آبادی نے براہ

راست اعلان جنگ کرر کھا تھا۔

سنو اے بستگانِ ذلفِ گیتی، ندا کیا آرہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر غلامی کی حیات جاوداں سے

اور ”شکست زنداں کا خواب“ میں کہتے ہیں۔

دیواروں کے نیچے آ آکر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی   سینوں میں تلاطم بجلی کا آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
کیا ان کو خبر تھی ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے   اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دہکتی تقریریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے   اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

ہندوستان کی سیاسی تحریک آزادی کی طرف قدم بڑھا رہی تھی، اردو کے شاعر ہر منزل پر پیش رو بنے ہوئے تھے۔ اصلاحات، رولٹ ایکٹ، وفاق، وزارتیں ہٹلر سے جنگ ہر سیاسی موڑ پر شاعروں نے اس وقت اپنی رائے پیش کی جب سیاسی لیڈر کانفرنسیں اور جلسے کر کے فیصلہ کرنے کے بارے میں مشورے کر رہے تھے۔

جنگ ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ جوش ملیح آبادی نے اردو ادب کو ایک نیا مزاج دینے کی کوشش کی۔ یہ جنگی مزاج بھی تھا اور ہندوستانیوں کی بند زبان کھولنے کا اعلان بھی۔ سیاسی لیڈر جو بات کہنے سے ڈر رہے تھے۔ وہ ایک شاعر نے کہدی۔

”ہم سے باغی قسم کے انسان کہتے ہیں یہ بات
صرف موسیٰ بن کے فرعونوں سے ملتی ہے نجات“

اور اس اعلان کے بعد انتہائی نفرت کے ساتھ انگریزی حکومت کو للکارتے ہیں۔

”خیر اے سوداگر واب ہے تو بس اس بات میں

وقت کے فرمان کے آگے جھکا دو گردنیں
اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی
وقت کا فرمان اپنا رخ بدل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے اب فرمان ٹل سکتا نہیں۔"

وقت کا یہ فرمان تو نہ ٹل سکا لیکن کہانی اس رنگ میں نہیں لکھی جا سکی جس کا خواب جوشؔ نے دیکھا تھا۔ سیاسی لیڈروں نے انگریز کے خون سے اس کہانی کی سرخی نہیں لکھی بلکہ قومی تحریک سے غداری کر کے انگریز سے صلح کر لی۔ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کو برابر کے حقوق دینا جنھیں پسند نہیں تھا انہوں نے ہندو مسلم بنیاد پر ملک کی تقسیم قبول کر کے آزادی کا وہ پروانہ حاصل کر لیا جس میں انگلینڈ کے تمام تجارتی اور مالی حقوق محفوظ رکھے گئے تھے۔

جس وقت پردے میں یہ گفتگو ہو رہی تھی ہندوستانی ادیبوں کے نمائندے جوشؔ نے قوم کو آگاہ کیا۔

فقیر برہنہ سے ہو رہا ہے راز و نیاز جناح اور جواہر منائے جاتے ہیں
وہ فتنہ ساز، جو کل تک تھے جیل کی خوراک وہ آج جیل کے درباں بنائے جاتے ہیں
جو سر کبھی نہ جھکے تھے جلالِ شاہی سے حضورِ حضرتِ ویول جھکائے جاتے ہیں
خدا کی شان جو باغی عدوئے سلطاں تھے وزیر نائبِ سلطاں بنائے جاتے ہیں

اور "جناح اور جواہر، دونوں انگریزوں کے گورنر لارڈ ویول کے "وزیرِ نائب سلطاں" بن گئے۔

ایک دور ختم ہوا۔ انگریزوں نے اقتدار کی باگ ڈور کانگرس کے ہاتھ میں دے دی۔ اور غیر ملکی حکومت کی گدی پر نوے سال کے بعد پھر ہندوستانی

قابض ہو گئے، لیکن یہ بہادر شاہ ظفر کے وارث نہیں تھے۔ برطانوی سرمایہ داروں کے وارث تھے۔ بہر حال ہندوستانی ادیبوں نے بھی آزادی کے گیت گائے، سیاسی حکمرانوں کے درباروں کو ادیبوں اور شاعروں نے زینت بخشی۔ قلم نے دنیا کو بتایا کہ ہندوستان آزاد ہو گیا اور قوم نے اس آزادی پر خوشی کے شادیانے بجائے سیاسی حکمرانوں نے اہل قلم کو اپنی نااہلی کا پردہ پوش بنانے کیلئے دفتروں، ریڈیو اسٹیشنوں اور صلاح کار اداروں میں بھرتی کر لیا۔ ادب کی زبان کچھ دن کے لئے بند ہو گئی۔ لیکن ایک دن یہ بند ٹوٹ گیا۔ نئے دربار شاہی سے جوشؔ ملیح آبادی کی آواز سنائی دی وہ پنڈت جواہر لال نہرو سے قریب تھے۔ مرکزی حکومت کے ملازم بھی تھے۔ لیکن جب وقت آ گیا تو انہوں نے ادب سے غداری نہیں کی۔ انہوں نے ایک طویل نظم "ماتم آزادی" لکھ کر آزادی کے چہرے پر ڈالے گئے نقاب کو پھاڑ کر پھینک دیا، دوسری نظم "رشوت" میں انہوں نے حکام کو ننگا کر کے ہمارے سامنے کھڑا کر دیا۔

جوشؔ نے اپنا فرض انجام دے دیا۔ انہوں نے لال قلعے کی فیصل سے اردو ادیبوں اور شاعروں کی طرف سے حق گوئی کا فرض انجام دے دیا۔ لیکن جوشؔ کے بعد کیا ہوا۔؟

مجھے جوشؔ کی ماتم آزادی کے بعد اردو ادب اور شاعری میں کہیں بھی وہ آواز سنائی نہیں دی جو حکمرانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی صدائے محمدی نہ سہی، بیابان میں پکارنے والے پیغمبر کی آواز ہی ہوتی۔

یہاں پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ادیب حکومت اور نظام حکومت سے بے تعلق رہ سکتا ہے۔؟

جواب نفی میں ہے۔ ادیب نہ تو حکومت اور نظامِ حکومت سے بے

تعلق رہ سکتا ہے اور نہ ایک غلط حکومت کے سائے میں آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے۔ اسے ایک اچھی حکومت اور صاف ستھرا ماحول چاہئے۔ اگر وہ اپنے ادب کے ذریعہ سے عوام کی خوش حالی۔ امن و سلامتی اور ہمہ جہت آزادی کی وکالت نہیں کرتا تو وہ درباری ادیب تو ہو سکتا ہے۔ -قصر سلطانی کے گنبد پر نشیمن تو بنا سکتا ہے لیکن وہ شاہین نہیں بن سکتا جس کا بسیرا پہاڑوں کی چٹانوں میں ہوتا ہے تاکہ آزاد ماحول میں رہ کر کسی کی پابندی کے بغیر قوم کے جذبات کا اظہار کرتا رہے۔

موجودہ اردو ادب روبہ زوال ہے کیونکہ اس نے حق گوئی اور بیباکی کی روایات کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ پچھلے بیس سال میں اردو ادب نے کوئی بیباک ادیب اور شاعر پیدا نہیں کیا۔ کچھ لوگ سرکاری اداروں میں چلے گئے۔ کچھ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں نظر آتے ہیں۔ کچھ اپنی کتابوں کی اشاعت اور ان پر انعام حاصل کرنے کی خواہش میں گرفتار ہیں۔ معاشی حالات نے قوتِ اظہار پر پابندی لگا رکھی ہے اس طرح اردو ادب جمود اور مجبوریوں میں گرفتار ہے۔

کچھ سر پھرے ادیب ہو سکتے ہیں مگر ادبی جتھے بندیوں نے انہیں غیر اہم بنانے کا فرض انجام دیا ہے۔ ان کی طرف کسی کی نظر نہیں جاتی۔

اس لئے یہ مضمون اپنے عنوان کے ساتھ ختم ہوتا ہے کہ

"۲۰۰۱ء میں اردو ادب اور شاعری واقعی روبہ زوال ہے۔"

"اردو میں دلت ادب"

مضمون کی ابتداء ہی میں بتاتا چلوں کہ ہندوستان ایک قدیم اور عظیم ملک ہے اور اس ملک میں آباد کروروں انسانوں میں سیکڑوں چیزیں مشترک ہیں تو ہزاروں مختلف۔ کتنے ہی مذاہب، زبانیں، بولیاں، نسلیں، رسم ورواج، رنگ روپ اور ذاتیں اپنی رنگارنگی۔ انتہاپسندی، دھما چوکڑی کے ساتھ چھما چھم کرتی نظر آتی ہیں۔ کوئی اپنی قدامت پر نازاں ہے تو کوئی اپنی نجابت پر فخر کرتا ہے۔ کسی کو ذات عزیز ہے تو کوئی اپنے رنگ روپ پر اکڑ رہا ہے کوئی تہذیب پر قربان ہے تو کوئی علاقائی تعصب کو گلے لگائے ہے۔ کسی کو مذہب پیارا ہے تو کوئی مادر وطن کی آنکھ کا تارا ہے۔ مادرِ وطن کے اسی آنکھ کے تارے کو پہلے داس کہا گیا پھر شودر قرار دیا گیا۔ پھر اچھوت بنایا گیا۔ گاندھی جی نے اسے ہریجن کہا اور ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر نے داس۔ شودر اچھوت اور ہریجن جیسے ناموں کو رد کر کے ایک نئے اور قابل قبول نام "دلت" سے یاد کیا۔ (یعنی متواتر دوہا جانے والا) تاکہ داس کی

غلامی، شودر کی حقیر زندگی، اچھوت کی لعنت اور ہریجن کی بدنامی سے نجات دلا کر ایک باوقار زندگی کے سفر میں شامل کیا جاسکے۔

موہن جداڑو اور ہڑپا کی سترہ سو سے ڈھائی ہزار سال قبل مسیح پر محیط تہذیب کو جب یورپ اور وسط ایشیاء کے گورے باشندوں "ایرینس" نے جو باختر اور شمالی ایران کے میدانی علاقوں میں آباد ہوگئے تھے۔ پامال کر کے مقامی باشندوں کو داس کے لقب سے یاد کرنا شروع کیا اور منو کے قانون کو سختی سے نافذ کیا تاکہ کسی محنت اور جدوجہد کے بغیر ملک کی بڑی آبادی پر حکمرانی کی جا سکے۔ کہا جاتا ہے کہ دیوتا برہما نے منو کے قانون کی تخلیق اور رشی بریگو کو اس کے بارے میں بتایا اور بریگو نے راجہ منو اور دوسروں کو ان سے آگاہ کیا دیانند سرسوتی نے اپنی کتاب "ستیارتھ پرکاش" میں لکھا ہے "کہ برہم وید کو کہتے ہیں، وید پرمیشور نے اگنی وغیرہ رشی منیوں پر اتارے ہیں اور جب رشی منیوں نے سنسکرت زبان کے ان ویدوں کو سمجھنے کی کوشش کی اور مراقبے میں غور وفکر کے در وا کئے تو پرمیشور نے انہیں اس کے معنی سمجھائے اور اس طرح وید کتابی شکل میں ظاہر ہوئے، اس طرح وید برہم ہیں اور برہم ہی برہمن"

سماج میں برہمن انسان کی شکل میں دیوتا ہے جس کے پاس ایسی روحانی قوتیں ہیں کہ بادشاہوں اور فوجوں کو لمحوں میں پامال کر سکتا ہے، دوسرے نمبر پر چھتری تھے جن کے سپرد ملکی نظم ونسق اور سرحدوں کی حفاظت تھی۔ یہ جنگجو اور جری لوگ تھے مگر انہیں برہمن کی افضلیت کو تسلیم کرنا پڑتا تھا۔ تیسرے نمبر پر ویش تھے، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں دوسروں کو نذر پیش کرنا ہے۔ دوسروں ہی پر زندگی گزرنی ہے اور جسے مرضی کے مطابق ستایا اور پریشان کیا جاسکتا ہے۔ یہ معمولی تاجر اور کاشت کار ہوتا تھا اور سماج میں نفع کمانے کی مشین

تھا۔ شودر چوتھے نمبر پر تھا۔ مذکورہ تینوں طبقوں کی فرمابرداری، آقا کی خدمت اور اس کا جھوٹا کھانا اترن اور پرانے اسباب کا استعمال کرنا ان کی ذمہ داری تھی۔

شودروں کے بارے میں منو کا قانون ہے کہ - برہمن کی خدمت بجالانے میں ہی شودر کو دونوں جہاں میں فائیدہ ہے، شودر برہم کی خدمت نہ کرے تب بھی غلام ہے۔ اگر شودر اونچی ذاتوں کا پیشہ اختیار کریں تو بادشاہ پر لازم ہے کہ ان کا مال ضبط کر کے ملک بدر کر دے۔ مال دار شودر کو بزور مال سے محروم کر دینا چاہئے، جس ملک پر شودر حاکم ہو وہ تباہ ہو جائے گا۔ شودر بادشاہ دس ہزار قصایئوں کے برابر ہے۔

(ماخوذ از، منو کا قانون، مصنف پیریار)

اس طرح ہندوستان کے دلتوں کو مذہبی، تہذیبی، معاشی اور سماجی طور پر اتنا مجبور ولاچار قرار دیا گیا ہے کہ ان کا احساس کمتری صدیاں گزر جانے کے باوجود انہیں آزاد ہندوستان میں بھی اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں سمجھتا۔ دلت سماج سے وابستہ افراد جن میں پس ماندہ اور اچھوت ذاتیں، یادو، لودھ، کرمی، کاچھی، کمہار، سنار، ہلوائی، بھرجی، گدڑیا، لوہار بڑھی، چمار، پاسی، بھنگی، دھوبی، کھٹک، اور نہ جانے کتنی ذاتیں شامل ہیں، صدیوں سے در بدر بھٹک رہی ہیں، کبھی انہوں نے گوتم بدھ کے دربار میں پناہ لینے کی کوشش کی، تو کبھی اسلام کے مساوات وانصاف کا دامن تھاما، کبھی عیسائیت میں اپنے لیے جائے پناہ تلاش کی تو کبھی ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر اور راما سوامی پیریار کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ کبھی کانگرس میں اپنے حقوق کا تحفظ تلاش کیا تو کبھی منڈل کمیشن کے گھنیرے سائے میں سانس لی۔ مگر اعلیٰ وباعزت زندگی کا خواب آج بھی ادھورا ہے۔

جہاں تک اردو میں دلت ادب کا سوال ہے تو اردو اپنی ابتدائی حالت میں لشکری زبان تھی جس میں مختلف قومیں شریک تھیں، جو بازاروں میں آئیں تو اس زبان کو استعمال کرنے لگیں جو عوام ہی کی زبان تھی۔ اہل دربار نے اپنی حقارت کے سبب اس زبان کو ریختہ یعنی گری پڑی زبان قرار دیا۔ یہ حقارت دلی کے معاشرے میں موجود تھی لیکن حیدر آباد دکن، گول کنڈہ اور بیجاپور میں نہیں تھی اس کا ثبوت یہ ہے کہ قلی قطب شاہ نے جو مثنویاں کہی ہیں یا نصرتی نے جو زبان استعمال کی ہے وہ ملکی تناسب کے اعتبار سے دکنی ہے ریختہ نہیں ہے۔ یہ دکنی زبان اپنے ابتدائی سلسلے میں گجرات سے وابستہ ہے کیونکہ ولی دکنی کے اجداد گجراتی تھے جو وہاں سے نکل کر جنوبی ہند میں آگئے تھے جنوبی ہند کی زبان رفتہ رفتہ ترقی کر کے سراج اور ولی دکنی بن چکی تھی۔ اسی زبان نے شمالی ہند پر اثر ڈالا اور ظہور الدین جاتم کو پیدا کیا۔ رفتہ رفتہ ریختہ اردو بن گئی اور عام انسانی مسائل کو شعر و سخن کی راہ سے داخل فکر کرنے لگی۔ اردو زبان کے شہر آشوب اور مثنویاں میرے بیان کا زندہ ثبوت ہیں۔ اس تمام ادبی سرمایے میں مساوات بشر اور بشری تصادم کا بھی ذکر ہے لیکن بشری تصادم شر کی بنیاد پر نہیں ہے۔ تمام شہر آشوب امیری اور غریبی کے ذکر سے مالامال ہیں یعنی مساواتِ بشر کے استحکام کے لئے طبقاتی مظالم کی شکایت کر کے سولہویں صدی جس میں بابا گرونانک اور قلی قطب شاہ نے اردو کے ابتدائی نمونے پیش کئے۔ بیسویں صدی کی آخری دہائیوں تک اردو ادب کے تحقیق، تنقیدی، سماجی، ادبی شعری اور افسانوی ادب کا مطالعہ کر جائیے تو آپ محسوس کریں گے کہ اردو کا دانشور طبقہ جو سماج کا سب سے زیادہ حساس، ذی علم اور انصاف پسند طبقہ کہلاتا ہے۔ مذکورہ کمزور دلت سماج کو کبھی بھی اتنی توجہ کا مستحق نہیں سمجھ سکا جتنا کہ ضرورت تھی۔

امیر خسرو۔ سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں" کہتے رہے۔ درد صوفیت کا دامن تھام کر چشم تر آئے اور دامن تر رخصت ہو گئے، میر، دلی کی بربادی پر آنسو بہاتے رہے اور چاند میں محبوبہ کا دیدار کرتے رہے۔ انشاء اللہ خان، ماشااللہ شان و شوکت کے شاعر تھے۔ شان سے جئے اور افسوسناک حالات میں رخصت ہوئے، مصحفی چولی سے عیاں بدن سرخ دیکھ کر للچاتے رہے۔ ، ناسخ اصلاح معاشرہ سے زیادہ، اصلاح زبان پر توجہ دیتے رہے؛ خواجہ آتش نے محبوب کے نقش پا کی خوب خوب زیارتیں فرمائیں، اسی طرح مومن، ذوق، اور غالب بھی زلف و کاکل کے اسیروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

دوسری طرف وہ لوگ جو اردو نثر کے قافلہ سالاروں میں شمار ہوتے ہیں، انہوں نے بھی زبان و بیان کی موشگافیوں میں خود کو الجھائے رکھا کبھی مقفع و مسجع طرز تحریر کی وکالت کی تو کبھی فورٹ ولیم کالج کی صاف و سادہ زبان پر توجہ فرمائی۔ لیکن اردو کا ترقی یافتہ زمانہ بھی اصلاح سماج سے تقریبا خالی ہے۔ مسدسِ حالی، مقدمہ شعر و شاعری، شعر العجم، آبِ حیات اور پھر سر سید احمد خان کے قومی وطنی رجحانات میں بھی دلت سماج کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ لیکن حالی کی مثنوی" حبِ وطن "میں سماج کے جن کمزور طبقوں کا ذکر ملتا ہے انہیں ہم دلت سماج کی ترجمانی قرار دے سکتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو سب کو آنکھوں کی پتلیاں سمجھو
گر رہا چاہتے ہو عزت سے بھائیوں کو نکالو ذلت سے

لیکن حالی سے قبل دلت سماج کا ایک عظیم ترجمان نظیر اکبر آبادی

ہماری توجہ کا مستحق ہے۔ اپنے محدود مطالع کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ نظیر ہندوستان کی دھرتی سے جڑا ہوا شاعر ہے، اس کی شاعری پر نہ تو فارسی شاعری کے اثرات ہیں اور نہ وہ اپنے پیش روؤں سے متاثر ہوا ہے۔ وہ ہندوستان کے کھیتوں سے آلو، گاجر، ہنڈا، مولی اور گھیاں کھود کر لاتا ہے اور بازار میں ڈھیر کر دیتا ہے اس کی دکان سے جو بھی سودا خریدتا ہے۔ اپنے ساتھ وطن عزیز کی مٹی کی سوندھی مہک ضرور لے جاتا ہے۔ نظیر نے سماج کے کمزور طبقوں کا خوب مشاہدہ کیا ہے اور ان کی حالتِ زار بیان کر کے ان کی ترقی کے لئے طبقہ اعلیٰ کو متوجہ کیا ہے۔

اک آدمی ہیں جن کے یہ کچھ زرق برق ہیں روپے کے جن کے پاؤں ہیں، سونے کے فرق ہیں
جھمکے تمام غرب سے لے تابہ شرق ہیں کمخواب، تاش، شال دوشالوں میں غرق ہیں
اور چیتھڑوں لگا ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

مفلس کی کچھ نظر نہیں رہتی ہے آن پر دیتا ہے اپنی جان وہ ایک ایک نان پر
ہر آن ٹوٹ پڑتا ہے روٹی کے خوان پر جس طرح کتے لڑتے ہیں اک استخوان پر
ویسا ہی مفلسوں کو لڑاتی ہے مفلسی

اردو ناول اور افسانے میں منشی پریم چند نے پہلی مرتبہ سماج کے کمزور طبقوں کے چہروں پر جمی ہوئی سیاہی کو اپنے قلم کی نوک سے کریدا تو اچانک پڑھے لکھے طبقوں نے چونک کر دیکھا کہ ہندوستان کی اس دنیا میں کیسے کیسے مظالم، کتنی غریبی اور کس قدر ناانصافی ہو رہی ہے۔ پریم چند نے جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام میں کمزور سماج کی حالتِ زار کا بھرپور محاسبہ کیا اور ہمیں ملک کے مظلوموں کی طرف متوجہ کیا۔

پریم چند نے اپنے افسانے کفن میں چماروں کی غربت، ان کی بے حسی

و بے فکری، شراب کی عادت اور عبرتناک زندگی کی بہترین ترجمانی کی ہے۔ فرماتے ہیں:

-"چماروں کا کنبہ تھا۔ اور سارے گاؤں میں بدنام گھیسوا ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام، مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو گھنٹہ بھر چلم پیتا، اس لئے انہیں کوئی رکھتا ہی نہیں تھا۔ گھر میں مٹھی بھر اناج ہو تو ان کے لئے کام کرنے کی قسم تھی۔"

پریم چند وہ واحد قلم کار ہیں جن کے دم سے اردو ادب میں دلت سماج کا بدنما چہرہ سامنے آیا ہے۔

اقبالؔ اگر چہ بنیادی طور پر اسلامی فکر کے شاعر تھے مگر اس شاعر دراز قامت نے ہندوستانی سماج میں برپا ناانصافیوں کی بھی ترجمانی کی ہے۔ ان کی نظم کارل مارکس اور نانک میں جو خیال سب سے زیادہ اجاگر ہوتا ہے وہ مساوات اور برابری کا علم بردار ہے۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں بھی جگہ جگہ ایسے اشعار کہے ہیں جو دلت سماج کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ نظم نانک میں فرماتے ہیں۔

آہ شودر کے لئے ہندوستان غم خانہ ہے　　دردِ انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے۔
برہمن سرشار ہے ابتک مئے پندار میں　　شمعِ گوتم جل رہی ہے محفلِ اغیار میں
پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے　　ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

دوسری جگہ کہتے ہیں۔

یارب یہ جہانِ گزراں خوب ہے لیکن　　کیوں خوار ہیں مردانِ جفا کش وہنر مند
گو اس کی خدائی میں مہاجن کا بھی ہے ہاتھ　　دنیا تو سمجھتی ہے فرنگی کو خداوند

پھر ترقی پسندوں کا زمانہ آیا۔ یہ فوجیں بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھیں اور میدانِ ادب پر قبضہ کر کے کمزور طبقات کے دشمنوں کا قتلِ عام شروع

کر دیا ترقی پسند شاعر اور ادیب مارکس، لینن اور اسٹالن کا فلسفۂ اشتراکیت لیکر آئے تھے انہوں نے جدید افکار وخیالات سے ادب کو مالامال کیا، ان کے دم سے مفلس غریب، نادار، کمزور اور دلت سماج نے بھی سر اٹھا کر چلنے کی کوشش کی، جس کے نتیجے میں جگہ جگہ ٹکراؤ بھی ہوتے رہے۔ جن کا سلسلہ آج بھی بہار اور اندھرا میں ختم نہیں ہوا ہے۔، ترقی پسندوں کا طبقہ انتہا پسند طبقہ تھا۔ ان کی تحریروں کے جارحانہ انداز نے کمزور سماج کو تو بیدار کر دیا لیکن ادبی لطافت میں کمی واقع ہو گئی۔ سجاد ظہیر رضیہ سجاد ظہیر، سبطِ حسن، جوشؔ، مخدومؔ، فیضؔ، فراقؔ، مجازؔ، سردار جعفریؔ، خواجہ احمد عباسؔ، کیفی اور پھر سید محمد عقیلؔ، عابد سہیلؔ، حیات اللہ انصاریؔ اور علی احمد فاطمی، جیسے اکابرین نے ترقی پسندوں کے جھنڈے تلے دلت سماج کو گھنگھور اندھیرے سے جگمگاتی ہوئی زندگی کی طرف لانے کی کوشش کی۔

جوشؔ نے کہا۔

یہ کھلونا! نہیں مرے معصوم
آگ اس کو سمجھ کے دور سے تاپ
میرے ننھے سے ماہِ تاب نہ رو
آسلا دے تھپک کے مفلس باپ

یہ ابھتی عورتیں اس چلچلاتی دھوپ میں سنگِ اسود کی چٹانیں آدمی کے روپ میں
کنکروں کے فرش پر دنیا سلاتی ہے جنہیں آندھیوں کے پالنے میں نیند آتی ہے جنہیں

مجازؔ نے اعتراف کیا۔

ابھی تو فاقہ کش انسان سے آنکھیں ملانا ہے
ابھی جھلسے ہوئے چہروں پر اشکِ خوں بہانا ہے
ابھی پامالِ جورِ آدم کو سینے سے لگانا ہے

مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر۔

فیض نے فرمایا۔

یوں ہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے اپنی ریت نئی
یوں ہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی
اسی سبب سے کسی کا گلا نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل برا نہیں کرتے

ان کے علاوہ بہت سے دوسرے گمنام ونامور خدامِ ادب نے بھی دلت سماج کی ترقی کے لئے زورِ قلم صرف کیا ہے۔

مصورِغم علامہ راشد الخیری کے ناولوں طفیل لاہوری کے افسانوی مجموعہ مزدور کی دنیا، حمیدہ برنی کے افسانوں اور ڈراموں کی کتاب "یہ بمبئی ہے" مائل ملیح آبادی کے ناول، نیا آدمی، روشندان اور زیتون، خان محبوب طرزی، ضیا عظیم آبادی اور وحشی محمود آبادی کے ناول دلت سماج کے ترجمان ہیں

آزاد ہندوستان میں دلت سماج پر تیزی سے کام شروع ہو چکا ہے، اس سلسلے میں ماہنامہ "آجکل" دہلی اور ماہنامہ "نیادور" لکھنؤ خاص طور پر قابل ذکر ہیں کہ اردو شاعر اور ادیب ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کے تعلق سے دلت سماج پر خاطرخواہ مواد فراہم کرتے ہیں۔ ٹی وی سیریلوں اور فلموں کے ذریعہ سے بھی ان کے مسائل اجاگر کئے جارہے ہیں۔ داکٹر راہی معصوم رضا کا ٹی وی سیریل "نیم کا پیڑ" دلت سماج اور زمین دارانہ طمطراق کا اعلیٰ ترجمان ہے۔

جنوبی ہندوستان میں ای وی راما سوامی پیریار نے منو کے قانون کے

خلاف زبردست تحریک چلائی جس کے نتیجے میں جیوتی باپھولے اور سنت گاڈ گے جیسے سماج سدھارک سامنے آئے۔ ان کے پیغام کو آگے بڑھانے کے لئے بنگلور میں "دلت ساہتیہ اکاڈمی" وجود میں آئی جو بہت بڑے پیمانے پر اردو میں دلت ادب پیش کر رہی ہے۔

”جوش شاعرِ روماں“

حضرت جوش ملیح آبادی مرحوم کی رنگارنگ، اختلافی اور تضادات سے پر زندگی و شاعری کا کسی ایک مضمون میں احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ جوشؔ نے تقریباً ۲۵ ضخیم دیوان چھوڑے سوانح حیات ”یادوں کی برات“ کے علاوہ مضامین کا مجموعہ ”اشارات“ و ”مضامین جوش“ اور ماہنامہ کلیم میں شایع ہونے والے اداریے اور مضامین ان کا نثری سرمایہ ہیں، ۱۹۲۰ء سے ۱۹۵۷ء تک ان کی شاعری غلام اور آزاد ہندوستان کی فضاؤں میں گونجتی رہی۔ ۱۹۵۷ء سے ۱۹۸۲ء تک وہ پاکستان کی اردو شاعری کی سب سے بڑی اور اختلافی شخصیت رہے۔ اس طرح جوشؔ ایک ایسے ادبی سمندر کا نام ہے جس کے کناروں کو تو محسوس کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی گہرائی اور وسعت کا اندازہ ناممکن ہے۔

ناقدین نے جوشؔ کو بہت سے اچھے اور برے ناموں سے یاد کیا ہے۔ کوئی

ان کی عظمت کے ڈنکے پیٹ رہا ہے تو کسی کے نزدیک ان کی شاعری محض الفاظ کی جادوگری اور لفاظی ہے۔ جس میں نہ فکر ہے نہ کوئی پیغام۔

جوشؔ، شاعرِ انقلاب، شاعرِ فطرت، شاعرِ جذبات، شاعرِ شباب اور شاعرِ بغاوت، جیسے القاب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ لیکن جوشؔ کو بیسویں صدی کی اردو شاعری کے تعلق سے کس نام سے یاد کیا جائے۔ اس کا فیصلہ جس ناقد کو کرنا ہے، شاید وہ ابھی پیدا نہیں ہوا ہے۔ کیوں کہ موجودہ عہد کے ناقدین عام طور پر پسند اور ناپسند کا شکار ہو کر یا ذاتی مخاصمت و محبت و مروت میں فیصلے صادر کرتے ہیں۔

میں اس مضمون کے ذریعہ سے جوشؔ کو شاعرِ رومان" کے طور پر پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کیونکہ جوشؔ کو شاعرِ انقلاب کا لقب "ہند" کلکتہ کے مدیر اور مولانا آزاد کے رفیق مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے دیا تھا۔ مولانا جوشؔ کے بھانجے تھے۔ جنگ آزادی کے سپاہی تھے، نامور صحافی تھے، اشتراکیت کے عظیم علمبردار تھے۔ ان کی عظمت کے اعتراف کے باوجود، ان کی رائے کو قبول کرنا دشوار ہے۔ کیونکہ اگر ہم جوشؔ کو شاعرِ انقلاب تسلیم کر لیں تو ان کی وہ شاعری، جس میں فطرت کا بیان ہے۔ جس میں وہ اپنے ماضی کو یاد کرتے ہیں، جس میں حسن و جمال کے تذکرے ہیں، جس میں عاشق و معشوق کا درد ہے، جس میں ایک بے نام غم کا ذکر ہے اور جس میں فکر و فلسفہ ہے یا مولوی سے چھیڑ چھاڑ کی باتیں ہیں۔۔ کس خانے میں فٹ کریں گے۔؟

کسی ملک میں انقلاب برپا ہونے کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اس کے معاشرے اور سیاسی نظم و نسق کی تمام بنیادیں از سرِ نو قائم کی جائیں اور ملک کو قدیم فرسودہ نظام کے بجائے ایک نیا نظام حیات دیا جائے جو وہاں کے عوام کے

مزاج کی ترجمانی کرتا ہو۔

بقولِ ہیگل ---فلسفۂ انقلاب دراصل ملک کی بیماریوں کی تشخیص اور پھر ان کا علاج ہے جو بعد میں قوم کو نئی توانائیاں عطا کرتا ہے۔"

ابن فرید بھی محسوس کرتے ہیں۔

--"جوش کی شاعری کو انقلابی کہنے کے بجائے باغیانہ شاعری کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ انقلابی شاعری کا ایک خاص تصور ہے جو موجودہ نظام کو تبدیل کرنا چاہتی ہے۔ اور پھر مارکسی روپ میں قائم کرنا چاہتی ہے۔"

جوش کے کلام میں انگریزی استبداد کے خلاف شدید احتجاج پایا جاتا ہے۔ انقلاب نہیں۔حسن اور مزدوری، زوال جہانبانی، کسان، نازک اندامانِ کالج سے خطاب، مقتل کانپور، ضعیفہ، بھوکا ہندوستان اور دردِ مشترک وغیرہ نظموں میں احتجاج ہی احتجاج نظر آتا ہے۔ جوش کی شاعری میں جذبہ آزادی ہے۔ افکار حریت ہیں۔ بغاوت کی شدید لہریں ہیں ،ایک پائدار، مضبوط' ہر دل عزیز ہندوستانی حکومت کی آرزو ہے، لیکن اس نظارے میں نہ کوئی انقلاب کا تار ہے۔ نہ انقلاب کا کوئی تصور ہے۔ نہ کوئی ایسی عظیم شخصیت ہے جو انقلاب کو لیے چلی جارہی ہو -اس لیے جوش کے کلام میں انقلابی تصورات کی تلاش ہی غلط ہے وہ بغاوت کے شاعر ہیں۔ احتجاج کے مشعل بردار ہیں۔ حریت کے پیغامبر ہیں اور آزادی کا وہ رومانی سازِ مسلسل ہیں جو صدیوں آدمی کو اپنی طرف متوجہ کرتا رہے گا

کلاسیکیت، رومانیت کی ماں ہے۔ وہ ادب جو بزرگوں کی عظمت اور ان کی یادگار کے طور پر تصنع کے ساتھ ماضی پرستی کے ذریعہ سے تخلیق ہوتا رہا اسے کلاسکی اور روایتی ادب کہا جانے لگا۔ روایتی لفظ کے بارے میں ٹی ایس ایلیٹ رقم طراز ہے۔

-"زیادہ سے زیادہ اِس لفظ کو "صفت" کے طور پر

استعمال کرتے ہوئے یہ کہہ دیتے ہیں کہ فلاں کی شاعری
روایتی یا حددرجہ روایتی ہے۔ یہ لفظ عیب اور مذمت کے
علاوہ شاذ ہی کسی دوسرے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔"

اپنے پیش رووں سے واقفیت کی بنا پر ہی شاعر یا ادیب ماضی پرست، روایتی یا کلاسکی کہلاتا ہے۔ یہی اس کی خوبی اور یہی اس کا عیب بھی ہے۔ اسی اندازِ فکر کے خلاف ردِ عمل کے طور پر اٹھاریں صدی کے آخر میں جو ادب وجود میں آیا اور اس ادب کو جن فنی عناصر سے مزین کیا گیا اسے شارحین نے "رومانیت" کا نام دیا۔ انیسویں صدی کے مشہور انگریز نقاد والٹر پیٹر نے رومانیت کو "جذبۂ تحیر کی بازیافت" کا مترادف سمجھا تھا۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں رومانی شعراء نے کلاسکی شاعری کی تصنع آمیز زبان کے خلاف آواز اٹھائی اور کلاسیکیت کے عقل پرستانہ رویے کے بجائے جذبے اور وجدان کی پرستش کرنے پر زور دیا۔ رومانی شعراء نے تسلیم کیا کہ تخیل، جذبہ اور وجدان رومانی شاعری کے تین محور ہیں ۔ رومانیت پرستوں کے ان جدید افکار و نظریات کے اثرات ہندوستانی زبانوں نے بھی تسلیم کئے ۔ اردو شاعروں اور ادیبوں میں حالؔی شبلؔی، آزاد اور اقبال، اسی تحریک کے آگے پیچھے چلنے والے رہنما ہیں۔ ان کے دور سے آج تک شعر وادب کے رومانی دھارے نے زندگی کے ہر مسئلے کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور ان تمام مسائل کو یکجا کرنے۔ سمیٹنے، اور زیادہ شدت، گہرائی اور سائنسی طریقے سے پیش کرنے کا فرض جوشؔ ملیح آبادی نے انجام دیا ہے جوشؔ کی رومانیت عقل کے سانچے میں ڈھل کر کاغذ پر آئی ہے، وہ سیدھی دل میں اتر کر عقل کو بیدار کرتی ہے۔ اس کے پہلو میں اقبالؔ کا وہ عشق بھی ہے جو آتشِ نمرود میں بے خطر کود پڑتا ہے اور وہ عقل بھی ہے جو کبھی محوِ تماشائے لبِ بام تھی۔

اگر عورت رومانیت ہے تو جوشؔ کی شاعری میں وہ اپنے حسن و جمال کے ساتھ موجود ہے۔ اگر فطرت نگاری کو رومانیت کہتے ہیں تو جوشؔ، ساون کے مہنے، برسات کی چاندنی، موج باراں، پہلی گھٹا، بھیگی رات، البیلی صبح، اور نظم، بدلی کا چاند میں فطرت کی بلائیں لیتے نظر آتے ہیں۔ اگر جذبے کو رومانیت قرار دیا جائے تو جوشؔ کی شاعری میں جوش و جذبہ اور ولولہ نظر آتا ہے۔ اگر ماضی پرستی رومانیت ہے تو جوش انگیٹھی۔ اور موسیقی کا جزیرہ جیسی نظموں کے خالق ہیں اگر حریت و آزادی رومانیت ہے تو جوش کے دم سے حریت و آزادی کی شمعیں روشن ہیں۔ اگر ایک بے نام غم سے لگاؤ کا نام رومانیت ہے تو "فاختہ کی آواز" کی غمناکی کو محسوس کیا جا سکتا ہے، اور اگر روایت پرستی سے بغاوت کا نام رومانیت ہے تو فتنۂ خانقاہ، مولوی' ذاکر سے خطاب اور مناجات جیسی نظمیں رومانیت کی اعلیٰ مثال ہیں۔

یہی سبب ہے کہ میں جوش کو شاعر انقلاب کہہ کر ان کے قد کو کم نہیں کرنا چاہتا بلکہ شاعر رومان کہہ کر اس میں اضافہ کر رہا ہوں۔ کیونکہ شاعر رومان میں ان کی ترقی پسندی بھی مجروح نہیں ہوتی۔

مضمون کو مختصر کرنے کے لیے جوشؔ کی صرف دو نظموں کا ذکر کروں گا تاکہ اپنے دعوے کو تقویت پہونچا سکوں۔ "کسان" جوشؔ کی بہت ہی کامیاب نظموں میں شمار کی جاتی ہے، فرماتے ہیں۔

جھٹپٹے کا نرم رودریا شفق کا اضطراب ۔۔۔ کھیتیاں، میدان، خاموشی، غروب آفتاب

یہ سماں اور اک قوی انسان یعنی کاشتکار ۔۔۔ ارتقا کا پیشوا، تہذیب کا پروردگار

سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی ۔۔۔ جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی

دھوپ کے جھلسے ہوئے رخ پر مشقت کے نشان ۔۔۔ کھیت سے پھیرے ہوئے منہ گھر کی جانب ہے رواں

بمبئی کی شہری زندگی سے ۱۹۰۱ء میں ایک آواز اٹھی تھی کہ ۔"سوراج ہماری پیدائشی حق ہے۔" یہ آواز بال گنگادھر تلک کو قید میں ڈالتی ہوئی سیاسی سفر کی پگ ڈنڈیاں بناتی رہی۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی میں، گاندھی، محمد علی جوہر، مدن موہن مالویہ اور موتی لال نہرو ابھر کر سامنے آگئے۔ اس پس منظر میں کسانوں کے قافلے رواں دواں ہونے لگے۔ جن کی ادبی اور رومانی سرداری جوشؔ ملیح آبادی نے کی ہے۔ ادبیت اور رومانیت، حقیقت پسندی اور منظر کشی، درد انگیزی اور انسان دوستی، فلکِ سیاست کی تاریکیاں اور بے کس بشریت کی ہمت نے اس نظم کو تیار کیا ہے۔ یہی وہ نظم ہے جو صدیوں تک ہندوستانی عوام کو جذباتی طور پر متاثر کرتی رہے گی۔ تہذیب کا پروردگار، ہمتوں کا خالق، ارتقاء کا پیشوا، دھرتی کو تابندہ کرنے والا اور بے کس بچوں کو پالنے والا کسان جوشؔ کے قلم سے ایک ایسا قدِ آدم پیکر بن گیا ہے۔ جس کے اثر سے ہندوستانی سیاست جنبش میں ہے۔ کسان کی دھمک، بشر کی دوستی اور بے کس کی آہیں اس نظم میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ نظم کی آہیں اس گہری رومانیت کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو انسان دوستی کی بلائیں لیتی ہوئی، نہرو اور پنتھ کو بیدار کرتی ہیں۔ جنہوں نے نظام زمینداری کا خاتمہ کر کے، کسان کے پاؤں کی بیڑیاں کاٹ ڈالیں، اسی نظم کے اثر سے وہ کسان سیکولرزم جنبش میں ہے جس نے ہندی، ہندو اور ہندوستان کے نعرے کے خلاف مورچہ لگایا ہے۔

نظم کسان، دانشوروں کو سمجھ اور صحت مند تنقید کا موقع دیتی رہے گی۔
اس نظم میں ایک جاگیر دار کا بیٹا۔ دماغی راہوں سے گزرتا ہوا کسان کے گلے میں بانہیں ڈالے ہے اور اس کی تعریف میں وہ قصیدہ پڑھ رہا ہے جو کبھی عرفی شیرازی جہانگیر کے حضور میں پڑھا کرتا تھا۔

یہ نظم ایک نئی قصیدہ نگاری ہے۔ جو عوامی جذبات کو گھیرتی ہے اسی نظم کے اثر سے احسان دانش کی نظم "باغی کا خواب" پیدا ہوئی ہے ایسی ہی کچھ نظمیں الطاف مشہدی اور سیماب اکبر آبادی کے یہاں بھی ملتی ہیں۔ جن کے عوام میں آجانے کے بعد صفی اور آرزو لکھنوی پھیکے ہوگئے ہیں کیونکہ یہ دونوں اساتذہ لکھنوی کی شہری زندگی کے گلدان ہیں۔ ان نظموں کے اثر سے اثر لکھنوی بھی ایک ایسا چمن نظر آنے لگے ہیں۔ جہاں امیروں کی بیگمات ٹہل سکتی ہیں۔

خاندان شاہی کے شہزادے گھوم پھر سکتے ہیں، رؤسائے والا گہر چہل قدمیاں کر سکتے ہیں اور خاندان پرنس سلیماں قدر اپنی عطر بیزیاں دکھا سکتے ہیں۔ لیکن دیہات کے نظارے، کھیتوں کے انسان ہلوں کی محنت، کدالوں کا حوصلہ، دردِ بشر اور عظمتِ بشر سے تیار ہونے والا ایک پیکر اور اس پیکر کے لیے فنکاری اور فنکاری کے ساتھ قصیدہ خوانی، یہ سب چیزیں جوش کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہیں جو ایک رومانی شاعر کی خصوصیات ہیں۔ دوسری نظم " موسیقی کا جزیرہ " ہے فرماتے ہیں۔

راگنی کی آنچ سے جب نرم ہو جاتے ہیں تار ۔۔۔ کانپتی ہیں انگلیاں مطرب کی جب مستانہ وار
لحن کے سانچے میں جب ڈھلتی ہے دل کی آرزو ۔۔۔ عشق کا جب نبضِ آہن میں مچلتا ہے لہو
اک جنوں پرور جزیرے میں پہونچ جاتا ہے دل ۔۔۔ لئے یہ زلفوں کی طرح جس وقت لہراتا ہے دل
جس کے کھو جانے سے میری زندگی تھی سوگوار ۔۔۔ روح ہوتی ہے جہاں اس گمشدہ شئے سے دوچار

اس موسیقی کے جزیرے میں جوش کی روح اس ماضی میں داخل ہو جاتی ہے جو شہد اور دودھ سے زیادہ شیریں ہے۔ وہ ماضی، ان کے اجداد کا ماضی ہے، وہ اجداد جو تاریخ ساز اور کارساز تھے جنھوں نے آزاد قبائل کے علاقہ سواد وبنیر میں اپنی سرداریاں کھڑی کی تھیں۔ جسے یاد کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ناز کرتی تھی یہاں بادِ بہاری اپنی
کل اسی راہ سے گزری تھی سواری اپنی
اب بھی جب صبح کو خیبر سے ہوا آتی ہے
دلِ آباء کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے۔

جو خاندان ماضی کی شیرینی رکھتے ہیں ان کے لیے اس نظم میں بڑا سکون ہے یعنی پرتھوی راج چوہان کے خاندان کے لیے یا خاندان راناپرتاب کے لیے یا لکھنؤ کے خاندان شاہی نیشاپور کے لیے یا سلطنتِ عباسیہ کے اجداد کے لیے۔ یا ایران کے شاہان قاچار کے لیے یا میڑھی اور گڑھوال کے رؤسائے قدیم کے لیے۔ یا ہماچل پردیش کے عظیم حکمرانوں کے لیے۔ یہ نظم ابدی مٹھاس ہے۔ عوام نہ اس نظم کی قدر کر سکتے ہیں۔ نہ اس جزیرے میں داخل ہو سکتے ہیں۔ یہ ایک کامل رومان پرور نظم ہے جو دل کو ایسی تسلی دیتی ہے جیسے کوئی گنگوتری میں اسنان کر کے تازہ ہو جائے۔ ہر تاریخی اور نامراد انانیت جو شعور سے آشنا ہے۔ اس نظم کے دامن میں پناہ حاصل کر سکتی ہے۔

تمہیں آہیں سننے کا شوق تھا، مگر اب بتاؤ کرو گے کیا؟
جو کراہتا تھا تمام شب وہ غریب جوشؔ تو مر گیا۔

"والی اور پارکھی"

رابرٹ فراسٹ کہتا ہے۔

"- میں، آپ کو ایک مٹھی گرد میں خوف وہراس دکھا سکتا ہوں"۔

کئی برس قبل، بالکل اسی طرح میرے ایک عزیز انور ندیم نے اپنے مضمون --والی ایک معمولی آدمی" میں ایک مٹھی گرد سے خوف وہراس پیدا کر دیا تھا۔ اور معمولی آدمی پر غیر معمولی گل افشانیوں کے ساتھ طویل تبصرہ فرمایا تھا۔

مجھ میں اتنی قابلیت تو نہیں کہ والی کو غیر معمولی آدمی بنا کر پیش کر سکوں لیکن اتنی جسارت ضرور کر رہا ہوں کہ والی نہ تو معمولی آدمی ہیں، نہ معمولی شاعر، کیونکہ والی میں وہ تمام خوبیاں اور گر موجود ہیں جو کسی آدمی کو، آدمی تسلیم کرنے کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔

والی، ایماندار ہیں، سچے ہیں، دوست ہیں، نمازی ہیں، خدا ترس ہیں، رقیق القلب ہیں۔ مہمان نواز ہیں اور اکثر معاون ومددگار بھی ثابت ہوتے ہیں-

آج کے پر فریب سماج میں، انفرادی معاشرے میں اور خود غرض دنیا میں کسی انسان میں اتنی خوبیاں جمع ہو جانا، بہت سی دوسری برائیوں کے باوجود، اسے انسان بناتی ہیں اور انسانیت کو احترام بخشتی ہیں۔

میں والی کو دیوتا کی سند نہیں دے رہا ہوں، نہ انہیں آدرش ناگرک بنا کر پیش کر رہا ہوں اور نہ انہیں لائق پرستش سمجھتا ہوں، اس کی پہلی وجہ تو میرا عقیدہ ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ والی انسان ہیں اور انسان میں برائیوں کا پایا جانا ہرن کے سینگوں کی طرح ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی والی انتہائی کھرّے اور بداخلاق بھی ہو جاتے ہیں،

قلم کار کی حیثیت سے میں، رتبے، دوستی اور رشتے داری کو بالکل فراموش کر دینے کا عادی ہوں، یہی وجہ ہے کہ میرے ہر مضمون کے بعد کوئی نہ کوئی پیارا دوست روٹھ جاتا ہے۔ جسے دوبارہ دوست تو نہیں بنایا جا سکتا، ہاں، سلام ودعا بحال کرنے میں ضرور وقت لگتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس مضمون کے بعد بھی ایک اور اچھے دوست کو بھول جانا پڑے، لیکن قلم رکھ کر کتاب میں ہی الجھے رہنے سے جو حبس پیدا ہوتا ہے اور ذہن میں جو طوفان اٹھتے ہیں ان سے خود کو محفوظ رکھنے کے لئے قلم چلانا ضروری ہے۔ جو لوگ قلم کو ہونٹوں پر انگلی کی طرح چلاتے ہیں وہ یا تو منافق ہوتے ہیں یا کم ہمت قلم کی زبان فولاد کی ہوتی ہے۔ اس لیے اسے تلوار کی طرح چلانا چاہئے اور چلاتے وقت اس بات کی قطعی پروا نہیں کرنا چاہئے کہ گردن کٹ رہی ہے یا پیتے کا تنا۔

والی آدمی ہیں، معمولی آدمی ہیں یا آدمی نہیں ہیں، یہ قصہ تو اب ختم ہو چکا، اس لیے اس پر خاک ڈال کر آگے بڑھ رہا ہوں اور یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ وہ شاعر بھی ہیں یا محض مماکھیوں کی طرح گلاب، بیلا، چمیلی، شہتوت، امرود،

آم، سیب، گیہوں، دھان نارنگی، موسمی، آڑو، لیچی، پپیتا، نیم، جنگلی پھولوں اور مختلف، میدانوں پہاڑوں، کھیتوں اور کھلیانوں سے رس اور مٹھاس چوس چوس کر اپنے چھتے میں۔ ''شہد'' جمع کر رہے ہیں۔

شاعری جتنا آسان شوق ہے اس سے کہیں زیادہ دشوار بھی ہے۔ ہر موزوں طبع شعر کہہ سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر موزوں طبع فکر کا سلیقہ بھی رکھتا ہو، شاعری موزونیت اور فکر کا نام ہے، اسی لیے نثری اور آزاد نظمیں کہنے والے بھی شاعر ہی کہے جاتے ہیں۔ جو شعراء اپنے افکار میں خون جگر صرف کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، وہ اعتبار اور احترام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن جو موزونیت کے سہارے غزلیں اور نظمیں گڑھتے ہیں وہ خود تو ناکام ہوتے ہی ہیں قاری کو بھی تھکا دیتے ہیں۔ موجودہ مطبوعہ شعری مجموعوں کا معیار گرانے کی جتنی ذمہ داری موزوں طبع شعراء پر ہے اس سے کہیں زیادہ سرکاری امدادی اداروں پر بھی ہے کہ ان کی امداد نے بہتوں کو ''امداد'' بنا کر چھوڑ دیا ہے۔ اسی لیے ہر صاحب دیوان، شاعر نہیں ہو سکتا۔ لیکن جو صاحب دیوان شاعر ہیں، ان میں والؔی آسی کو شامل کرنا، میری مجبوری نہیں ضرورت ہے کیونکہ زبانوں کی زندگی کے ضامن شعراء بھی ہوتے ہیں۔

لگے ہاتھوں آپ کو والی آسی کے کمزور پہلوؤں سے بھی آشنا کراتا چلوں تاکہ ان کا محاسبہ کرنے میں آپ کو وہ دشواری نہ جھیلنا پڑے جو مجھے بعض دوستوں کے اشعار سننے میں جھیلنا پڑتی ہے۔ والؔی آسی کی شعری زندگی کا سب سے کمزور پہلوان کے تخلص کے ساتھ آسی کی شمولیت ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ محترم آسی الدنی مرحوم اردو ادب کے ان معماروں میں ہیں جنھوں نے تحقیق، شاعری، نثر اور لغت کے میدان میں ناقابل فراموش نقش چھوڑے ہیں۔ لیکن

ان کی عظمت کا رعب بٹھا کر اپنی عظمت کے لیے راہ ہموار کرنا، احساس برتری کی کوشش ہے اور دوسرا کمزور پہلو شہد کی وہ ابتدائی اشاعت ہے۔ جسے ''دیونا گری لپی'' میں ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اس بات کو اچھی طرح یاد رکھنا چاہئے کہ جو شخص غلطی پر ہو، اسے غلط سمجھا جائے۔ اس کی عظمت سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں۔

میں محسوس کرتا ہوں کہ والی کی شخصیت سے متعلق جو اعتراضات کئے جا سکتے ہیں، میں نے ان کی طرف اشارہ کر دیا ہے، یہ ذکر غیر ضروری نہیں تھا کیونکہ قاری کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے محبوب اور پسندیدہ شاعر کی نجی زندگی کے اوراق کی بھی ورق گردانی کرے۔ شاعر عوام کی ملکیت ہوتا ہے محض اشعار ہی پر نہیں۔ اس کی زندگی پر بھی عوام برابر کے حقوق رکھتے ہیں اسی لیے شاعر کی ذاتی زندگی کا تصور بے معنی اور لغو ہے۔

والی آسی کے مجموعہ کلام ''شہد'' کی جلد پلٹیے اور والی کی شخصیت کی دلکشی کا اندازہ لگائیے۔

-''مجھے اپنی شاعری کے سلسلے میں کوئی خوش گمانی نہیں ہے کہ بہت پہلے یہ بات میرے علم میں آچکی تھی کہ میں ایک معمولی آدمی ہوں اور یہ کہ میری شاعری انقلاب کی بشارتوں سے عاری ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اب تک جو کچھ بھی لکھا ہے وہ کورے سفید کاغذ کو سیاہ کرنے سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے ہاں، جس دن سے میں نے یہ دعا مانگنا شروع کی ہے کہ میں جو کچھ بھی لکھوں اس کی رہنمائی میں لکھوں جس نے مجھے انسانوں کی شکل وصورت عطا کی۔ بس اسی دن سے میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میری ذات مجھ پر منکشف ہوتی چلی جا رہی ہے اور میں درمیان سے ہٹتا چلا جا رہا ہوں''۔

اس اقتباس سے آپ نے شاعر کی ذہنی کیفیت اور اس کے اندازِ فکر کا اندازہ ضرور لگالیا ہوگا کہ شاعر نے خود کو قادر اور قاری کے حوالے کر دیا ہے اور اب اس کی حیثیت بادبان اور لنگر کے بغیر اس کشتی کی سی ہے جو سمندر میں ہواؤں کے سہارے، تھپیڑوں کے سہارے، مچھلیوں کے سہارے اور خدا کے سہارے ڈگمگاتی رہتی ہے اور اس بات کی دعوت دیتی رہتی ہے کہ کوئی آئے اور مجھے اپنی مرضی کے مطابق اپنی سمت کا تعین کر کے، بہالے جائے، اسی لیے میں کہتا ہوں کہ والؔی کا کلام قابل مطالعہ ہے کہ اس میں قارئین کی دلی کیفیات کی ترجمانی اور مرضی کے مطابق مواد و معنی کی فراوانی ہے۔

والؔی کا شعری سلسلہ مصطفیٰ زیدی، ناصر کاظمی، سلیم احمد، احمد ہمیش، احمد فراز، افتخار عارف، کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض سے جا ملتا ہے شاعروں کا سلسلہ اور یکساں شعری فضا کی کہانی نئی نہیں ہے ولؔی سے والؔی تک جتنے عہد گزرے ہیں اور جتنے اسکول وجود میں آئے ہیں سب کے یہاں یکساں شعری فضا کی یکسانیت موجود ہے۔ اسی لیے کوئی غالؔب سے ٹکرایا ہے۔ کوئی مومن سے لڑا ہے اور کوئی ذوق کے یہاں سرقہ تلاش کرتا نظر آتا ہے۔ خیالات کی یکسانیت ناگزیر ہے۔ دو سو برس کی اردو شاعری کو کھنگال ڈالئے تو آپ کو پانچ فیصد مجرّد خیالات و افکار ہی ملیں گے، بقیہ ہزاروں شعراء کے لاکھوں اشعار میں زبان و بیان کے جادو اور موشگافیوں کے علاوہ کچھ نہیں ملے گا۔ اور زبان و بیان کے اس جادو میں وہ تمام خوبیاں پنہاں ہوں گی جو شعراء کو وقار اور قبولِ عام بخشتی ہیں۔ افکار و خیالات کے فقدان کی موجودگی میں چوری کا الزام عاید کر دینا بالکل آسان ہے اور عام قاری کے لیے اس پر یقین کر لینا بھی معمولی بات ہے۔ لیکن جو لوگ فن شاعری کے رموز و نکات سے واقف ہیں وہ نسخ و انتقال، مسخ و اغارہ اور سلخ والمال کا فرق

سمجھتے ہیں۔

والؔی پر سب سے پہلا الزام سرقے کا لگایا جاتا ہے۔ اور یہ الزام وہی لوگ لگاتے ہیں جو دنیا کے شعری اسٹیج پر مقبولیت اور ہر دل عزیزی کی ہوڑ میں ان کے حریف ہیں، ابھی تک کسی سنجیدہ ناقد یا صاحبِ نظر نے ایسا کوئی الزام نہیں تراشا ہے جو لوگ سفر میں والؔی کے ہم سفر ہوتے ہیں۔ دوستی کا اظہار کرتے ہیں۔ کھانے کی میز پر مرغ کی ٹانگ ان کی طرف بڑھاتے ہیں۔ والؔی کو چھیڑ کر ان کے سینے سے علم کھینچتے ہیں، وہی ان کی ٹانگ بھی کھینچتے ہیں اور ان کے اشعار کا مزاق بھی اڑاتے ہیں۔

موجودہ شعراء میں جہاں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں وہیں مطالعے سے باپ مارے کا بیر ہے۔ اسے والؔی کا عیب کہئے یا ہنر انہیں مطالعے کا شوق کچھ زیادہ ہی ہے اس کی ایک وجہ تو گھریلو علمی ماحول ہے اور دوسری بڑی وجہ کتابوں کی صحبت ہے اس صحبت نے انہیں نقصان بھی پہونچایا ہے اور فائدہ بھی۔ نقصان یہ ہوا ہے کہ جن شعراء کا گزشتہ سطروں میں تذکرہ ہے وہ والؔی پر بھوت کی طرح سوار ہو گئے ہیں۔ اور فائیدہ یہ ہوا ہے کہ مطالعے میں وہ اپنے ہم عصروں سے ممتاز نظر آتے ہیں،

والؔی کا شعری سفر روایت کی پگ ڈنڈی سے شروع ہوا ہے اور اب وہ جدیدیت کی شاہراہ پر ڈگمگا رہے ہیں۔ نہ روایت بری ہے نہ جدیدیت کیونکہ ہر شاعری روایت بن جاتی ہے اور ہر نیا شعر جدید ہوتا ہے، دراصل مسائل تبدیل ہوتے ہیں۔ حالات بدلتے ہیں اور خیالات میں تندی پیدا ہوتی ہے۔ سو یہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے، کل جب شاہی تھی تو شہ کا مصاحب بن کر غالؔب اتراتا پھرتا تھا۔ آج جمہوریت ہے تو لیڈر کی مصاحبت کر کے "فلاں" اتراتا پھرتا ہے،

انداز وہی پرانا اور روایتی ہے محض نام اور حالات تبدیل ہو گئے ہیں۔ کل جو روایت تھی۔ آج جدیدیت ہو گئی ہے۔ آج کی جدیدیت کل روایت بن جائے گی۔

والی کی شاعری میں نیا پن، مانوسیت اور جذباتیت کا احساس جاگتا ضرور ہے لیکن اکثر ایک چمک کی طرح، ایک لپک کی طرح اور ایک عارضی آسودگی کی طرح۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کی شاعری کا تاثر دائمی کب بنے گا لیکن اتنا اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ چاندی جیسے بالوں والا فقیر منش شاعر ایک دن کچھ کر کے ضرور دکھائے گا، کیونکہ جن نئے شعراء نے کچھ کر کے دکھایا ہے ان کا کلام بعض دفعہ مجھے والی سے کمتر درجے کا دکھائی دیا ہے۔ والی کی مجبوری یہ ہے کہ وہ کسی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر نہیں ہیں، ان سے لوگوں کے مفاد وابستہ نہیں ہیں اور ان سے کسی کو کوئی مالی یا ادبی فائیدہ پہونچنے کی امید بھی نہیں ہے۔ اگر ایسا کچھ ہوتا تو یقیناً والی آسی کا نام حسن کمال 'افتخار عارف اور احمد فراز کے ساتھ لیا جاتا۔ اس کا یہ مطلب نہ نکالئے کہ یہ شاعر کمتر درجے کے ہیں کم از کم افتخار عارف اور احمد فراز کے بارے میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ یہ دونوں شاعر ہماری نئی شاعری کی آبرو ہیں۔

والی آسی نے جو کچھ کہا ہے اس کا وافر حصہ شہد میں شایع ہو چکا ہے اور شہد کا کلام قابل مطالعہ ہے، اس کلام کو پڑھنے کے بعد یہ احساس شدید ہو جاتا ہے کہ موجودہ سماجی ڈھانچے کی حقیقتوں میں زلف و کاکل نے ضمنی حیثیت اختیار کر لی ہے اور زندگی کی دوسری زندہ حقیقتیں شاعر کے سامنے دریائی گھوڑے کی طرح منہ کھولے کھڑی ہیں۔ عورت ہمیشہ سے اردو شاعری پر مسلط رہی ہے اور یہ ایسی بلا ہے جسے کوئی اوجھا، کوئی فقیر اور کوئی شعبدے باز شاعر کی شخصیت سے دور نہیں بھگا سکا ہے لیکن آج جب بیاہتا عورتوں نے شاعر، فلسفی، ادیب لیڈر،

کلرک، اخبار نویس اور نکھٹو شوہروں پر گیلی لکڑیوں آٹا دال، آلو، مٹر، دھنیا اور مرچ، فیس اور کتابوں، جہیز اور کپڑوں کا بوجھ ڈالنا شروع کر دیا ہے تو ان کے سروں پر محبوبہ اور معشوقہ کو پنجہ ٹیکنے کی جگہ ہی نہیں مل رہی ہے، اسی لیے کوئی نیا نیاز فتح پوری اور اختر شیرانی غیر حقیقی پیکر تراش کر نفسیاتی مریضوں کی بھیڑ نہیں جمع کر رہا ہے۔

والی کی شاعری میں چاندی بالوں، تتلیوں، خوابوں، فقیروں، بچوں اور دعاؤں کا ذکر جی بھر کر ہوتا ہے۔ شاعر کی یہ مجبوری ہے کہ وہ چند مخصوص لفظوں کا استعمال ساری زندگی کرتا رہتا ہے، یہ کوئی بری علامت نہیں ہے لیکن اگر علامتوں کا استعمال معیاری اور فصیح ہو تو علامتیں اچھی چاٹ کا مزہ دیتی ہیں۔ والی اس فن سے نہ جانے کب واقف ہو گئے ہیں کہ ان علامتوں کے استعمال کے بعد جتنے خوبصورت الفاظ تلاش کر کے استعمال شدہ علامت کی جگہ فٹ کیجیے --" مجا نہیں اٹی ہے"۔ اور کبھی کبھی تو یہ بھی ہوتا ہے کہ ناکامی خود ہی منہ دیکھنے لگتی ہے۔ یہاں پر میں اپنے قارئین سے یہ سوال کرتا ہوں کہ کیا شاعر کی یہ خوبی قابل اعتناء نہیں؟

اگر قابل اعتنا ہے تو والی کو کیوں نہ اچھا شاعر تسلیم کر کے ان سے مزید امیدیں وابستہ کی جائیں کہ اردو شاعری کو ایک اور سند میسر آجائے مگر لگتا ہے کہ آپ کو میری رائے اور مشورے کو قبول کرنے میں تامل ہے تو ذرا زحمت کر کے دو چار گام اور میرے ساتھ چلیے تو میں آپ کو والی کی شاعری کی چند اور خصوصیات سے آشنا کراؤں،

شہد کے صفحات کھولیے

محبتوں کی ادا کے سوا کچھ اور نہیں　　فقیر پاس دعا کے سوا کچھ اور نہیں

اس شعر کو یوں دیکھئے کہ فقیروں کی دنیا کتنی سچی دنیا ہے ان سے آپ محبت بھی لے سکتے ہیں اور دعائیں بھی۔ ان دعاؤں اور محبتوں کی قیمت کو وہی لوگ زیادہ جانتے ہیں، جن کے سینے میں انسان کا دل ہے۔ کیونکہ آج کی دنیا میں مان کا پان بہت ہے، جن لوگوں کو اپنی کمائی ہوئی اور آئی ہوئی دولت کا اندازہ نہیں ہے وہ اس جزیرے میں نہیں داخل ہو سکتے جس میں دلوں کی، محبتوں کی، دعاؤں کی، دوستی کی، قربانیوں کی اور رواداریوں کی دنیا مسکراتی اور مہکتی ہے۔

دس روپے روز کا مزدور جب فقیر کو چٹکی بھر آٹا دیکر دعائیں لیتا ہے تو فقیر اور مزدور دونوں کو خوشی ہوتی ہے۔ اور ایک آسودگی نصیب ہوتی ہے لیکن ایک کروڑ پتی جب چارٹر اکاؤنٹنٹ کو غلط حساب بنانے کے عوض ایک لاکھ روپیہ پیش کرتا ہے تو دونوں ایک دوسرے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور چوروں کی طرح جدا ہو جاتے ہیں۔ والؔی خود کو فقیر کہہ کر اسی لئے فخر محسوس کرتے ہیں کہ اس زندگی میں جو مزہ ہے وہ کسی بناوٹی زندگی میں نہیں۔ جو لوگ والؔی کو قریب سے جانتے ہیں، وہ واقف ہیں کہ ان کے پاس سے سوالی کم ہی واپس جاتا ہے۔

میں کتابی کیڑوں کو علم کی سند نہیں دیتا۔ میں تو علم کا اندازہ اس بات سے لگاتا ہوں کہ موضوعِ گفتگو شخصیت کی پسند اور ناپسند درست ہے یا نہیں اسے اچھی باتیں مرغوب ہیں یا بری اشیاء، اسی پسند اور ناپسند کو ذوق کہا جاتا ہے اور ذوق ہی سے دلکشی پیدا ہوتی ہے۔ والؔی کی شخصیت کی دلکشی، ان کی آنکھوں، بالوں، گالوں، خیالوں اور ذہن کے اجالوں میں تلاش کی جا سکتی ہے، والؔی کی آنکھوں میں نمناکی ہے، ان کے بالوں میں تجربات کی چمک ہے۔ ان کے گالوں پر محنت سے کمائی ہوئی روٹی کی سرخی ہے، ان کے خیالات میں گنگوتری جیسی پاکیزگی اور

طہارت ہے اور ان کے ذہن کے اجالوں میں ایک ایسی دنیا آباد ہے جہاں انقلاب کی بشارتیں تو واقعیٔ نہیں ہیں۔ لیکن ایسا بہت کچھ ہے جو بہر حال سامعین اور قاری سب کو اچھا لگتا ہے یہی وجہ ہے کہ والؔی کے رشتے عوام سے ذرا گہرے ہیں اور عوام انھیں محبت کی نظر سے دیکھنے کے لیے مجبور ہیں۔ اور یہ مجبوری فطری مجبوری ہے۔ بالکل ویسی ہی مجبوری جو ایک ماں کو اپنے بچے سے محبت کرنے والے غیر مرد سے ہوتی ہے کہ دل اس کی طرف خود بہ خود کھنچ جاتا ہے اسی لیے عقل مند لوگ بچوں کے لئے کھلائیاں رکھتے ہیں، کھائیاں نہیں۔

یہ درست ہے کہ عوامی مقبولیت بڑا شاعر ہونے کی دلیل نہیں کہ حفیؔظ جالندھری، اور جگؔر مراد آبادی مقبولیت کی معراج پر پہونچنے کے باوجود بڑے شاعر نہیں بن سکے۔

والؔی کی عوامی مقبولیت کا راز ان کی شاعری اور شخصیت کی دلکشی میں پوشیدہ ہے کیونکہ دلکش شخصیت کا مالک اپنے فن میں بھی شخصیت کی دلکشی اور نزاکت سمو دیتا ہے، اگر شخصیت میں دلآویزی نہیں تو ٹکنیک کا کوئی حسن، اس کا کوئی کمال، اس کی کوئی سحر انگیزی فن پارے کو بے روح اور بے جان ہونے سے بچا نہیں سکتی۔

اہل چین کا یہ عقیدہ ہے کہ اگر شاعر کی اخلاقی اور جمالیاتی شخصیت عظیم نہیں تو وہ کبھی عظیم شاعر نہیں ہو سکتا۔

بڑا شاعر ہونے کے لیے فکر وخیال کی بلندی کے ساتھ ہی، بڑی شاعری کا وجود بھی ضروری ہے۔ ممکن ہے والؔی کی شاعری بڑی شاعری نہ ہو لیکن یہ شاعری ایسی ضرور ہے کہ ذہن ودل کے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ میر تقی میؔر کی شاعری میں جس طرح نشتروں کو تلاش کیا گیا ہے بالکل اسی طرح میں نے ''شہد''

سے شیرینی نکالنے کی کوشش کی ہے، ان اشعار کو نوکِ زبان پر رکھیے اور بتایئے کہ شیرینی میں اعتدال ہے یا تلخی؟

تمہارا شہر کیا اس کا بدل دے پائے گا ہم کو | ہم اپنے گاؤں کی گلیوں میں ساون چھوڑ آئے ہیں
مرے گھر میں کہرام ہوتا رہا | مگر میرا ہمسایہ سوتا رہا
روز دو چار ہمیں غم نئے دے جاتی ہے | زندگی کیا یہی پیمانِ وفا ہے ہم سے
یہ حویلی مدتیں گزریں کہ ویراں ہو گئی | اک کبوتر رہ گیا یادوں کے روشندان میں
انہیں آندھیوں کا بڑا خوف ہے | وہی لوگ جو شامیانوں میں ہیں
پڑ چکا گاؤں میں برسات کا پہلا پانی | بھینی بھینی کسی خوشبو کا زمانہ آیا
اگر کوئی حسیں منظر کہیں تمکو نظر آئے | اسے میرے لیے تم اپنی آنکھوں میں چھپا رکھنا
سب لوگ آسماں کی طرف دیکھتے رہے | جا کر سمندروں پہ گھٹائیں برس گئیں

مجھے ان اشعار میں فکر، زندگی، تغزل کی چاشنی، لکھنویت اور تازگی محسوس ہوتی ہے، ممکن ہے آپ میری رائے سے اختلاف کریں۔ سو آپ کو اختلاف کا پورا حق ہے۔۔ میں تو اپنی بات کہ چکا۔

"عشرت کرتپوری اور میری نظر"

ہندوستانی مسلمانوں کی طرح اردو غزل نے بھی بڑے دکھ اٹھائے ہیں۔ وؔلی نے جس غزل کا پودا لگایا تھا۔ اسے بہت دنوں تک استادوں نے سینے سے لگائے رکھا لیکن فرانس میں رومانی تحریک کے جنم لینے کے بعد اردو غزل کے اصلی چہرے پر انسانی تکان کی جھلکیاں نظر آنے لگیں۔ اور پھر ترقی پسند تحریک نے غزل کی دراز زلفوں کو کتر دیا۔ اس کے ہونٹوں کی سرخی کو سماج کی تلخی سے بدل لیا اور اس کی خوبصورت آنکھوں کو مزدور کے کھردرے ہاتھوں نے کارخانوں کی چمنیوں کے دھویں سے سیاہ کر دیا۔ اور پھر آزاد شاعری، جدید غزل اور نئے نئے شعری تجربات نے میرؔ، غالبؔ، مومنؔ اور داغؔ کے تغزل کے مقابلے پر ایک ایسی غزل کو لا کر کھڑا کر دیا جو بالکل غیر مانوس اور اجنبی تھی۔ ایک مرتبہ کسی کے کچے مکان کی دیوار گر گئی تو تمام شاعروں نے صحن میں رستے بنا لیے۔ ایک شاعر نے زندگی کی شام کے خوف میں محبوب کی یادوں کے اجالے چرا لیے۔ پھر ایک شخص پانی کے گھر میں قیام کرنے لگا۔ ایک تاجر برف کے بانٹ لے کر دھوپ

میں بیٹھ گیا۔ ایک شاعر نے پہلی بار یہ انکشاف کر کے لوگوں کو چونگا دیا کہ "جہاز خود نہیں چلتے خدا چلاتا ہے" اور پھر ماں کا زمانہ آ گیا، شادی کے دوسری ہی دن سے اپنی دلہن کے ساتھ ماں کا گھر چھوڑ کر الگ رہنے والے شعراء بھی ماں کے بغیر نوالا نہیں توڑتے تھے لیکن یہ جھوٹ بھی چل نہیں سکا۔ پھر کربلا کے موضوعات وعلامات نے غزل میں گھر کیا، مگر قیام نہیں کیا۔ غرض یہ بیقراری کا دور ہنوز جاری ہے۔ اس دور میں کچھ اچھے اشعار بھی ابھر کر آئے اور نئے شاعروں نے بھی قبولیت حاصل کی، غزل کی مقبولیت میں بھی اضافہ ہوا، غزل کے جسم پر کلیم الدین احمد اور جوشؔ ملیح آبادی نے جو زخم لگائے تھے وہ کسی حد تک مندمل ہو گئے۔ لیکن اردو شاعری کو یہ نقصان ضرور ہوا کہ نظم کی شاعری جوشؔ اور اختر الایمان کے بعد ختم ہو گئی۔ دیکھئے یہیں سے مجھے عشرتؔ کرتپوری کی بابت کچھ عرض کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔

رومانیت، کلاسیکیت کے رد عمل کے طور پر وجود میں آئی تھی کلاسیکیت بری چیز نہیں تھی لیکن پرانی ہو گئی تھی اور اب انسان کو آزادی ماضی پرستی، جذباتیت، انقلاب، مناظر فطرت اور عورت میں زیادہ لطف آنے لگا تھا۔ وہ محنت، بزرگوں کے احترام، طرح طرح کی سماجی اور اخلاقی پابندیوں سے اکتا چکا تھا۔ وہ آزاد اور کھلی فضاؤں میں چھلانگیں لگانا چاہتا تھا۔ اور وہ آج بھی یہ سب کچھ کر رہا ہے۔ لیکن اتنی ہنگامی اور تیز روز ندگی میں بھی جو مزہ اخلاقیات میں ہے۔ پرانے اصول وضوابط میں ہے۔ کلاسیکل شاعری میں ہے۔ شاید کہیں بھی نہیں۔ کتنے انقلاب آئے اور گئے لیکن میرؔ زندہ ہے۔ غالبؔ شناسی کا کام ہنوز ادھورا ہے مومنؔ، آتشؔ، شادؔ، ناسخؔ، داغؔ، حسرتؔ، اور یگانہؔ کو کوئی آنچ نہیں۔

--اسی لیے عشرت کرتپوری جیسے بزرگ اور اپنی روایت اور کلاسکیت

سے جڑے ہوئے شاعر آج بھی احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں،

محبت میں رقابت کو گوارا کون کرتا ہے
تری خاطر رقابت کو گوارا کر لیا میں نے

محبت کے یہ تیور اور عشق میں جسارت اور قربانی کی یہ ادا ہمارے روایتی شعراء کا ہی طرۂ امتیاز ہے۔ عشرتؔ صاحب کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے اپنی غزلوں میں ندرت، سادگی، ستھرائی اور مضمون آفرینی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ وہ مضامین جنھیں عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ عشرتؔ کرتپوری نے انہیں کو آبدار موتیوں کی طرح غزل کے اشعار میں پرو دیا ہے۔

عشرتؔ کے کلام میں ہمارے اساتذہ کے پسندیدہ الفاظ خزاں، بہار، مصائب، غم، گل، جام، وصال، فراق، آشیاں اور بلبل بکثرت پائے جاتے ہیں لیکن ان الفاظ سے شاعر نے کہیں کہیں ایسے معنیٰ اخذ کئے ہیں جو بالکل نیا تجربہ ہے۔ عشرت صاحب فصلِ بہار کا استقبال بھی کرتے ہیں اور خزاں رسیدہ پھولوں کے انجام سے بھی واقف ہیں

مُسَلّم آمدِ فصلِ بہاراں
مگر وہ پھول جو مرجھا گئے ہیں

یہ ٹیگور کا وہی خیال ہے کہ "ہر بچہ یہ پیغام لیکر آتا ہے کہ خدا ابھی اپنے بندوں سے مایوس نہیں ہوا ہے"

یہ قانونِ قدرت ہے، لوگ آتے جائیں گے اور جاتے جائیں گے پھول کھلتے جائیں گے اور مرجھاتے جائیں گے، موسم بہار میں کونپلیں ہرے ہرے لباسوں میں نمودار ہوں گی اور پیلا جامہ پہن پہن کر معبود حقیقی سے ملتی جائیں گی اور شاعر مایوسی اور امید کی کشمکش میں مبتلا رہ کر کہتا رہے گا۔۔۔

"مبارک آمدِ فصل بہاراں"

عشرت صاحب کے کلام میں، ان کی زبان میں، ان کے افکار و خیالات میں اتنا دم ہے کہ وہ فطرت کا مزاج بدل سکتے ہیں لیکن اپنی روایات اور وضع سے جڑے رہنے کے سبب وہ چاہتے ہوئے بھی خاموش ہیں۔ حالانکہ انہیں اعتراف ہے کہ۔

جن کی تحریر بدل سکتی ہے فطرت کا مزاج
لکھ رہے ہیں وہ حدیثِ لب و رخسار ابھی

عشرت کرتپوری اپنے محبوب سے بڑے سلیقے سے باتیں کرتے ہیں۔ اور اپنے بزرگوں اور خاندانی روایات و شرافت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

اور بڑھ جائے گی ملنے کی تمنا تم سے — اس لئے ترکِ ملاقات سے ڈر لگتا ہے۔
ظلمتوں کو بڑے خلوص کے ساتھ — ہم نے نورِ سحر میں ڈھالا ہے
آپ خوابوں کو سجانے میں لگے ہیں ورنہ — وقت تو آپ کی چوکھٹ پہ کھڑا ہے کب سے
وہ شخص جس سے کوئی تعلق نہیں مجھے — یادوں کی سیڑھیوں سے اترتا دکھائی دے

یہ ایسے اشعار ہیں، جن میں کسی شاعر کے پورے فکری سفر، مزاج کے نشیب و فراز، زبان و بیان کی خوبیاں اور عشق و محبت کی داستانیں پڑھی جا سکتی ہیں۔ یہ کلام قابل اعتنا بھی ہے اور قابلِ مطالعہ بھی یہ کسی بے نمکی کا شکار بھی نہیں ہے، اس میں ملاحت ہے۔ مٹھاس ہے۔ تشنگی ہے، آسودگی ہے، بے چینی ہے، سکون ہے، کشمکش ہے، قرار، ہے۔ یہ گھنیری سایہ داریوں کی شاعری ہے۔ یہ خوشبودار پھولوں کی وادی ہے، یہ مترنم جھرنوں کی آواز ہے۔ یہ پچھلے پہر کا سناٹا ہے۔ یہ شام کی بزم آرائیاں ہیں۔ یہاں بنارس کے گھاٹوں کے سڈول جسموں کے نظارے ہیں۔ یہاں ملک کے سلگتے ہوئے شہروں کی داستانیں ہیں۔ یہاں

رہنماؤں کے افکار کی آلودگی ہے اور یہاں محبوب کے ہونٹوں کی پاکیزگی ہے۔

یہ شاعری اسٹیج کی اداکاریوں کی شاعری نہیں۔ یہ شاعری مشاعروں میں داد حاصل کرنے کے لیے بھی نہیں ہے۔ یہ شاعری، کتابوں کی شاعری ہے، فکر کی شاعری ہے۔ اس میں اتنی بے وزنی بھی نہیں ہے کہ فوراً داد حاصل کر لے، ایسی شاعری پر جیسے جیسے غور ہوتا جائے گا، اس کی پرتیں اور جوہر کھلتے چلے جائیں گے۔

عشرت کرتپوری نے شاعری کے علاوہ نثر کے میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ روایتی غزل کے شاعر ہیں۔ انہوں نے اساتذہ کا مطالعہ خوب کیا ہے۔ ان کے اشعار میں اساتذہ کے لباس کی خوشبو ہے جو ہمیں معطر بھی کرتی ہے اور اپنے شاندار ماضی سے جوڑتی بھی ہے۔

”ترقی پسند تحریک مرحوم“

اردو کے تعلق سے ایک اور آواز خاموش ہو گئی، ایک اور شمع بجھ گئی، ایک اور خلا پیدا ہو گیا، یعنی محترم سردار جعفری، جنہوں نے اپنی زندگی کا سفر کمیونسٹ کارکن کے طور پر شروع کیا تھا اور پھر ترقی پسند تحریک میں شریک ہو کر اردو میں شاعری شروع کی تھی، انتقال کر گئے۔ اور ہم اردو والوں کو لاجواب کر گئے کہ اگر کوئی سوال کرے کہ اس وقت ملک میں اردو کا اہم شاعر کون ہے تو کوئی جواب نہ دے سکیں۔

جعفری صاحب بڑی شہرت کے مالک تھے، اور ان لوگوں کے محبوب شاعر تھے، جو اردو شاعری اور شاعری کی تاریخ سے ناواقف ہیں، حکمرانوں اور نوکر شاہوں میں بھی انہیں اہمیت حاصل تھی، ترقی پسند تحریک کے تو وہ آخری اور مضبوط ستون تھے، ان کے انتقال نے نام نہاد، ترقی پسندوں کو بالکل لاوارث اور

تنہا کر دیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی زندگی میں سب سے زیادہ حسد کرنے والے یہی ترقی پسند تھے۔ اگر آپ برداشت کرلیں تو یہیں پر یہ بھی عرض کر دوں کہ خود مرحوم جعفری صاحب کے اعصاب پر ہمیشہ فیضؔ سوار رہے اور وہ ''فیض کامپلکس'' کا شکار رہے۔ کیونکہ فیضؔ نے ہندوستان کے علاوہ دوسرے تمام ملکوں کے اردو حلقوں میں سردار کو بہت نقصان پہنچایا اور ان کا چراغ جلنے نہیں دیا۔ تقریباً یہی حال کسی زمانے میں جوشؔ کا تھا کہ اقبالؔ نے ان کی نیند حرام کر رکھی تھی، لیکن جوشؔ چونکہ ایک بڑی شاعری کے مالک تھے اور ان کی شاعری کا دامن وسیع تھا، اس لئے اقبال کی آندھی میں بھی جلتے رہے۔

اقبالؔ سے جعفری تک جتنے شعراء نے ترقی پسند تحریک کی ڈولی اٹھائی ہے ان میں سب سے کمزور کندھا سردار جعفری مرحوم کا ہی تھا، سردار کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن افسوس کہ انہیں عوامی مقبولیت حاصل نہیں ہوسکی جبکہ انہوں نے نظم میں بہت زور مارا، ان کے مقابلے پر دوسرے شعراء نے اچھی شاعری کر کے مقبولیت بھی حاصل کی، یہاں اقبالؔ کا ذکر کرنا فضول ہے کیونکہ اقبالؔ ترقی پسند شاعری کے قافلہ سالار تھے، ترقی پسند تحریک کے نہیں، یعنی وہ کمیونسٹ نظام حیات کے پیرو نہیں تھے بلکہ انسان کو مساویانہ حقوق دلوا کر اُس کی عظمت کا اعتراف کروانا چاہتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ''آہ شودر کے لئے ہندوستان غم خانہ ہے۔'' اسی طرح جوشؔ بھی ترقی پسند نہیں بلکہ خالص رومانی شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں جہاں کہیں کسان۔ مزدور، کمیونزم۔ آزادی، غلامی اور انقلاب کی آواز گونجتی ہے وہیں وہ رومانیت کے علمبردار ہو جاتے ہیں۔ انقلاب کے نہیں، جوشؔ ہی کی طرح فیضؔ بھی ایک کربناک رومانیت کے شاعر ہیں۔

یہ ترے حسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا خمار
چاندنی راتوں کا بیکار دہکتا ہوا درد
دل کی بے سود تڑپ جسم کی مایوس پکار
چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز

لیکن اگر ترقی پسند یہ ضد کریں گے کہ آلام کی گرد۔ شکستوں کا خمار۔ اور جسم کی مایوس پکار میں ترقی پسندی مضمر ہے تو میں بحث بھی نہیں کروں گا۔ اس موقع پر ایک مزدور شاعر احسان دانش کا ذکر ضروری ہے۔ یہ شاعر واقعی مزدور کے کرب سے واقف ہے۔ اس کی نظمیں مزدور کی دیوالی، برسات، مزدور کی عید اور باغی کا خواب۔ ترقی پسندی کا اعلیٰ نمونہ ہیں:

ان کے ایمانوں میں رخنے تھے۔ وفا میں داغ تھے
دل تھا ناقص دامن صدق و صفا میں داغ تھے
خانقاہوں میں دلوں کا مدعا بکتا رہا
مدتوں ان کی دکانوں میں خدا بکتا رہا

شکاری دوست میں کہتا ہے۔

یہ کبھی آبادیوں میں آکے غراتے نہیں
یہ کسانوں اور مزدورں کا حق کھاتے نہیں
ان سے بڑھ کر وہ درندے ہیں شقی دل گرگ خو
چوس لیتے ہیں جو مزدوروں کی شہہ رگ سے لہو

احسان دانش ہی کی طرح ترقی پسندوں میں ایک اور بانکا شاعر مخدوم

محی الدین ہے، جس نے کہا:

یہ جنگ ہے جنگ آزادی　آزادی کے پرچم کے تلے
ہم ہند کے رہنے والوں کی　محکوموں کی مجبوروں کی
آزادی کے متوالوں کی　دہقانوں کی مزدوروں کی
سارا سنسار ہمارا ہے　پورب، پچھم، اتر، دکھن
ہم افرنگی ہم امریکی　ہم چینی جاں بازانِ وطن
ہم سرخ سپاہی ظلم شکن　آہن پیکر، فولاد بدن

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مذکورہ شعراء نے تحریک سے وابستگی کے ساتھ معیاری اعلیٰ اور قابل ذکر شاعری بھی کی ہے۔ لیکن جوڑ توڑ اور ضمیر فروشی میں مہارت نہ ہونے کی وجہ سے ایوان شاہی میں ان کا گزر نہیں ہو سکا جبکہ کمزور شاعری کے ساتھ اس میدان میں قدم رکھنے کے باوجود سردار جعفری نے بیسوں چھوٹے بڑے انعامات حاصل کر کے فخر محسوس کیا اور پھر ان کے چاہنے والوں اور درازی عمر نے انھیں گیان پیٹھ پر سوار کرادیا۔ جعفری صاحب اپنے لیے سیمینار کروانے، دوست ناقدین سے فن شاعری پر مضمون لکھوانے اور اقتدار کی چوکھٹوں پر اپنے نام کی دستک دلوانے کے فن سے اچھی طرح واقف تھے۔ یہ ان کا عیب نہیں تھا بلکہ میں اس کو ہنر مانتا ہوں کیونکہ جو شاعر اور ادیب ایسا نہیں کر سکتے وہ اپنی تخلیقات کے بوجھ تلے دب جاتے ہیں۔ وہ زمانہ تو چلا گیا جب فنکار کی قدر کی جاتی تھی اور فنکار ملک و قوم کی امانت ہوا کرتا تھا۔ اس زمانے میں اگر آپ کے قلم میں انیسؔ، اقبالؔ۔ اور جوشؔ جیسا دم نہیں ہے تو محض " راستے بند ہیں سب کوچہ قاتل کے سوا" کے سہارے آپ رومی دروازے سے

چھوٹے امام باڑے تک بھی نہیں جا سکتے۔

سردار جعفری جوڑ گانٹھ کی شاعری کرتے تھے۔ان کی تعلیمی نیو میں عربی، اور فارسی کا مسالہ پڑا ہے، اس لئے زبان و بیان پر انہیں قدرت حاصل ہے لیکن ان کے کسان، مزدور، فقیر، مفلس، بھوک، دربدری اور انقلاب کو جس زبان کی ضرورت ہے وہ ان کے پاس نہیں ہے، یہی سبب ہے کہ ان کا کلام نہ کھیتوں میں پڑھا گیا، نہ کھلیانوں میں ، نہ گاؤں میں نہ عوامی جلسوں میں، نہ جوانوں میں، نہ انقلاب کے دیوانوں میں۔ دوست، احباب اور رشتے دار کسی کو کہاں تک سہارا دے سکتے ہیں، اسی لیے میں کہتا ہوں کہ سردار کی شاعری لیچی کی طرح ہے جس میں ڈنٹھل، چھلکا اور گٹھلی زیادہ ہے گودا کم، جبکہ پھل اور فن گودے کے بغیر پھیکا پھیکا لگتا ہے۔

جانے کیوں ترقی پسندوں نے شاعری کو ''سہرا'' بنانے پر اتنا زور قلم صرف کیا کہ اماں، ابا، پھوپھا، پھوپھی، چچا، چچی، بہن، بھائی اور پھر دوستوں کے نام نظم کرنا ضروری ٹھہرا یعنی یہ کہ کسان، مزدور، مفلس، بیوہ، افلاس، غریبی، استحصال، زردار، مالک۔ کھیت۔ کھلیان، اور ظلم و ستم کے ذکر کے بغیر ان کی نظمیں مکمل ہی نہیں ہوتیں، وہ جوان عورت میں بھی صرف پھٹا ہوا دامن دیکھتے ہیں، بھوکا کسان دیکھ لیتے ہیں، جگمگاتی ہوئی زندگی نہیں کھیت، کھلیان اور کچے مکانوں پر ان کی نظریں خوب پڑتی ہیں، کوٹھی، بنگلہ اور کار دیکھ کر ان کا چہرہ اتر جاتا ہے۔ حلوائی کی دکان کے سامنے مٹھائی کے پتے پر بھنکتی ہوئی مکھیاں اور ان پر بیک وقت کتے اور انسان کا حملہ ان کی محبوب ذہنی غذا ہے مگر پانچ ستارہ ہوٹلوں میں غریب آدمی کا داخلہ اُنھیں برداشت نہیں، کیونکہ اگر اسے وہ زندگی میسر آگئی تو ان کی

شاعری کا موضوع ہی فنا ہو جائیگا۔ اسی لیے ترقی پسند چاہتے ہیں کہ کسی کو ان کی ضرورت نہ پڑے بلکہ وہ اپنی ضرورت کے لیے عوام کو استعمال کرتے رہیں۔ یہ نظریۂ فکر انھیں تاؤمت سے زیادہ قریب کرتا ہے۔ مفلسوں سے نہیں کیونکہ تاؤمت کے پیرو کا نصب العین یہ ہوتا ہے کہ کسی کو اس کی ضرورت نہ پڑے کیونکہ جس شخص کی ضرورت عوام کو نہ ہو وہ رنج و غم اور عوامی ذمہ داریوں سے آزاد رہ سکتا ہے، جبکہ بودھ مت کے پیرو چاہتے ہیں کہ انھیں کسی کی ضرورت نہ ہو۔ اس طرح ترقی پسند وہ خوش باش لوگ ہیں جو ذمہ داریوں سے فرار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تاؤ کے فلسفے کے سب سے اہم پیرو چوانگ زے نے یہی تعلیم دی ہے کہ ممتاز نہ بنو، زیادہ کام کے آدمی بننے کی کوشش نہ کرو، اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ وہی جانور دیوتاؤں پر چڑھائے جاتے ہیں جو زیادہ تندرست ہوتے ہیں۔ خوبصورت پرندوں کو شکاری تلاش کر کے ہلاک کرتے ہیں تاکہ ان کے رنگین پروں کو نوچ کر ڈرائنگ روم کی زینت بنائیں، اس سلسلے میں چوانگ زے نے ایک حکایت بھی سنائی ہے وہ کہتا ہے کہ کفن چوروں نے ایک قبر اس لئے کھودی کہ مردے کا کفن نوچ لیں اور مردہ نکال لیں، انہوں نے مردے کی کھوپڑی توڑی، جبڑوں کی ہڈیاں چور چور کردیں، کیونکہ انہیں کسی نے بتایا کہ اس قبر میں جو مردہ دفن ہے اس کے منہ میں انمول موتی ہے گویا مردے کی بے حرمتی کا سبب صرف یہ ہوا کہ اُس نے ایک موتی منہ میں رکھ کر دفن ہونے کی حماقت کی تھی، یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ کوئی بھی ادیب زندگی کے کسی حصے میں عوامی زندگی میں نہیں داخل ہوا بلکہ اپنے مکان میں قید رہ کر عوامی مسائل کی نشاندہی کرتا رہا اور اپنے ساتھیوں کو بانسوں پر چڑھاتا رہا۔ جس کے

نتیجے میں سجاد ظہیر کا خط یا ڈائری جو کچھ کہہ لیجئے۔ "لندن کی ایک رات" افسانہ، ناولٹ یا ناول میں سے کوئی چیز قرار پایا اور ایک غیر اہم کتاب ترقی پسندی کا شاہکار ٹھہری۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کو صرف تین مخلصوں احسان دانش، مخدوم محی الدین اور ساحر لدھیانوی کا احسان مند ہونا چاہئے کہ ان تینوں بزرگوں نے اپنے قلم اور شخصیت کو عوام کے لئے وقف کیا، ان کے علاوہ جتنے نام ہیں سب نے اپنی خدمت کی، اپنے لیے شاعری کی اور اپنی عظمت میں چار چاند لگانے کی جگاڑیں سوچتے رہے۔ جوشؔ جاگیر دار گھرانے سے آئے جاگیر داری کے خاتمے کے بعد چند سال حالات کا جائزہ لیتے رہے اور پھر ملک چھوڑ گئے۔ مجازؔ جن کے لئے ہوش میں رہنا ضروری تھا، ایسے بیہوش ہوئے کہ جاگے ہی نہیں۔ معین احسن جذبی اور سجاد ظہیر اپنی آرام و آسائش میں مبتلا رہے۔ سردار جعفری خوب سے خوب تر کی تلاش میں دلی اور بمبئی کے چکر لگاتے رہے۔ کیفی کی شاعری تو بے جان تھی ہی افسوس کہ بیماری نے اور کمزور کر دیا۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ ترقی پسند بے عمل لوگ ہیں جبکہ رومانی شعراء اور رومانی تحریک سے وابستہ لوگ بڑے باعمل لوگ ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ رومانیت پسندوں نے اپنا سفر فرانس سے شروع کیا اور پھر ساری دنیا میں پھیل گئے اور کہیں بھی پابہ زنجیر نہیں رہے۔ برہنہ پھرے۔ بال بچے چھوڑے۔ ہپی بن گئے۔ جھرنوں، پہاڑوں۔ دریاؤں اور جنگلوں کی سیر کی، مذہب، روایات اور سماجی بندھنوں کو ٹھوکر ماردی، فقیروں کی چلم پر گانجے کے دم مارے اور رئیسوں کی جھوٹی، بچی ہوئی شرابیں پیں۔ انسانوں سے ٹوٹ کر محبت کی، غربت اور امیر کے

جھگڑوں سے آزاد رہے اور اپنا ایک عظیم گروہ تیار کر لیا۔

یہ ہے مختصر اور بالکل سامنے کی داستان ترقی پسندی، اگر چاہتا تو ترقی پسندی، حقیقت نگاری، رومانیت، جدت پسندی، جدیدیت، تصور نگاری، جمالیات اور نہ جانے کیا کیا سپر قلم کر کے، بائرن، وسلر آسکر وائلڈ، شان فلیورو، موپاساں، فلابیئر اور کروچے کا ذکر کر کے آپ کو تھکا دیتا۔ مگر میری کوشش صرف اتنی ہے کہ عام قاری تک اپنی بات پہنچا سکوں، اسی لیے محترم سردار جعفری مرحوم کے لئے مغفرت کی دعا پر مضمون ختم کرتا ہوں اور انہیں خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آب بقائے دوام لے ساقی

"لکھنؤ کا نمائندہ شاعر"

آنکھ کھولی تو ماں کو دیکھا کان کھلے تو ماں کے ماموں حضرت جوشؔ ملیح آبادی مرحوم کے چرچے سنے یا والدمحترم جناب مائلؔ ملیح آبادی کے ناول پڑھے --- بس اتنی سی ادبی دنیا میں لکھنا پڑھنا شروع کیا --- مگر جب ہائی اسکول پاس کر کے لکھنو، پہنچا تو اتنے شاعروں اور ادیبوں سے تعارف ہوا کہ خود بھی شعر وادب کی طرف مائل ہو گیا۔ اس زمانے کا لکھنو، سراجؔ، سالکؔ، ماہرؔ، فیروز نظامی، فہمیؔ، حیاتؔ، تسنیمؔ، والیؔ، سعید اخترؔ، ہزار۔ماچس، مصورؔ، آفتابؔ، کلؔ، قمر اور ناظرؔ خیامی وغیرہ سے پہچانا جاتا تھا۔ امینؔ سلونوی صاحب مرحوم کے پندرہ اگست کے مشاعرے میں شاعر کو ایک روپیہ اور عبد اللہ ہوٹل کی ایک چائے نذرانے کے طور پر ملتی تھی، اس مشاعرے سے کل ہند مشاعروں تک کا سفر اور ان کی کامیابی کی ضمانت یہی اساتذہ تھے -- مگر آج تیس برس بعد آنکھ اٹھا کر دیکھتا

ہوں تو اس لمبی فہرست میں فیروز، تسنیم، والی، مصور، اور سعید اختر کے علاوہ سب کے لیے میر کا یہ شعر ہی یاد آتا ہے۔

کیا صور تیں الٰہی اس دیس بستیاں ہیں
اب جنکے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

والی ان دنوں مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت ہیں، سعید اختر اچھے شعر کہہ کر بھی، دین، دوست اور معاش میں مبتلا ہیں، مصور اور فیروز نظامی احاطہ لعل خاں کی مسجد آباد کئے ہوئے ہیں اور تسنیم ہمارے مضمون کا موضوع ہیں،

لکھنؤ جہاں نوابوں، امام باڑوں، رواداریوں، تہذیب و تمدن، شعر وادب، تبرہ و مدح صحابہؓ سے پہچانا جاتا ہے۔ وہیں یہاں کی مروتیں، دلداریاں اور پاس داریاں بھی مشہور ہیں۔ تکلفات کی کتنی ہی جھوٹی اور سچی کہانیاں زبان زد ہیں ریلوں کی تیز رفتاری کے باوجود "پہلے آپ" میں عوام مبتلا ہیں کوٹھوں کی سیر نہیں ہے، بیلے کے ہاروں میں خوشبو کا تصور باقی ہے۔ چہرے نقابوں سے باہر ہیں، نظریں خوب سے خوب تر کی تلاش میں چکرا رہی ہیں، پہلے عشق ہوتا تھا۔ اب سودا ہوتا ہے، پہلے شراب کی بدمستیاں تھیں اب مزاج کی بدکرداریاں عام ہیں، پہلے ادبی محفلیں برپا ہوتی تھیں۔ اب تجارتی مشاعرے ہوتے ہیں اور ان مشاعروں میں ادب تلاش کرنے کے لئے باقاعدہ کسرت کرنا پڑتی ہے۔

اتنی افراتفری اور ہنگامہ خیزی میں کسی شاعر اور پھر اس کے کلام کی پرکھ کرکے اچھی یا بری تصویر پیش کرنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے اور مجھے اسی دشوار رہ گزر سے گزرنا بھی ہے اور اپنے پاؤں کو زخموں سے بچانا بھی ہے۔

میں نہ تو انگریزی ادب کا مطالعہ کئے ہوئے کوئی عظیم ناقد ہوں نہ گردہ

بند ادیب میرے ہاتھ میں قلم ہے اور قلم کی زبان پر جو کچھ آجاتا ہے وہ بیان کردیتا ہوں-- میں نے عرض کیا ہے کہ میں تسنیم فاروقی کو گزشتہ تیس برس سے جانتا ہوں لیکن ان کے کلام مطبوعہ سے میری ملاقات دس برس سے ہے۔ میں فن کو شخصیت کے تابع سمجھتا ہوں اور تسلیم کرتا ہوں کہ عظیم شاعری پیش کرنے والا شاعر، عظیم شخصیت کا مالک ہوگا اور بے حقیقت شخصیت کا مالک بے حقیقت فن پیش کرے گا۔ جس شاعر کی شخصیت جذباتی ہوگی اس کا کلام بھی جذباتی ہوگا، عشرت پسند شاعر کا کلام لذتوں سے بوجھل نظر آئے گا جبکہ نفاست، نرمی اور خوش کلامی برتنے والا شاعر، نرم و نازک اور لطیف کلام پیش کرتا ہے۔

اب اگر میں یہ اعتراف کروں کہ تسنیم فاروقی، ایک جذباتی، عشرت پسند ،نفاست اور نرمی کے دلدادہ اور خوش کلام شخصیت کے مالک ہیں تو آپ کے سامنے ان کے کلام کی خصوصیات واضح ہو جائیں گی۔ میں تسنیم کے اس اعتراف سے اتفاق کرتا ہوں کہ وہ کلاسیکل، جدید یا ترقی پسند شاعر نہیں ہیں، وہ بڑی سنہری، بڑی رسیلی، بڑی رنگیں، بڑی معتدل اور بڑی جامع شخصیت کے مالک ہیں اور اس قسم کی خصوصیات کا مالک محض رومانی فنکار ہی ہوتا ہے۔ تسنیم فاروقی، بصیرت، مذاق سلیم اور ذوق کا نام ہے اور یہ تینوں خصوصیات بیباکی کے بغیر ممکن نہیں، اسی لیے ان کے کلام کی بیباکی اور تحریر کی تیز روانہیں رومانی فنکاروں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔

تسنیم کو اعتراف ہے کہ "-- میرے افکار میں فرسٹیشن سے پیدا ہونے والی پستیوں سے عذر ہے۔ زیادہ تر ایسے حساس مسائل ہیں جن میں صرف سچ اور سمت نمائی ہے۔ تہذیب کے گرتے ہوئے قلعوں اور حویلیوں کا حزن و ملال ضرور ہے مگر اس کی از سرنو تعمیر و تصور کا پیغام اور اضطراب ہے۔ گھٹن ہے--

میرے یہاں نظائر کی پیشوائی ہے۔ میرا کہا ہوا یا لکھا ہوا، ادب کی صادق شرائط کا پاسدار ہے۔ میرے یہاں صوتی امتزاج اور ریشمی لفظیات کی گہر آفرینی ہے،،۔

اس شدید اعتراف نے شاعر کی فنکاری اور شخصیت کے بہت سے پہلو نمایاں کر دیے ہیں اور اس سچائی کو پیش کر دیا ہے کہ فنکار کی پسند اور ناپسند میں اس کی عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ کوئی فنکار کتنا ہی تعلیم یافتہ ہو، کتنی ہی کتابوں کا مطالعہ کر چکا ہو۔ اگر وہ اچھی اور بری، پسندیدہ اور ناپسندیدہ، لطیف اور بدرو چیزوں میں فرق نہیں کر سکتا تو وہ احساس لطیف کا مالک یا بڑا فنکار نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ بہت سے تعلیم یافتہ حضرات بصیرت اور مذاق سلیم سے یکسر پاک ہوتے ہیں۔

چینی مفکر کنفیوشس نے کیا خوب کہا ہے "علمیت کے بغیر سوچ بچار انسان کا دماغ ہلا دیتی ہے لیکن غور و فکر کے بغیر علمیت اسے تباہ کر کے رکھ دیتی ہے"۔

تسنیم فاروقی کے کلام میں غور و فکر کا جو تصور اور جو کوشش ہے اس نے انھیں تباہی سے بچا لیا ہے اور وہ سیدھے رومانیت کی وادیوں میں گم ہو گئے ہیں، رومانیت ایک ایسی لطیف اور سبک پرچھائیں ہے جو شاعر کے ذہن پر سایہ فگن ہو جاتی ہے۔ اور پھر شاعر اسی پرچھائیں کے تابع ہو جاتا ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے اشاروں پر حرکت کرتا رہتا ہے۔ یہی لطیف اور سبک پرچھائیں تسنیم فاروقی کو کبھی قلعوں، کھنڈروں اور حویلیوں میں لے جاتی ہے۔ کبھی ماضی کے سنہرے خواب دکھائی ہے۔ کبھی آزاد فضاؤں کی سیر کراتی ہے۔ اور کبھی صوتی امتزاج اور ریشمی لفظیات کی گہر آفرینی میں مبتلا کر دیتی ہے اور انہیں کہنا پڑتا ہے۔

یہ اہل دل جو تجھے دیکھتے رہے یونہی
تری نگاہ کی رعنائیاں چرا لیں گے

حوصلے چاند چھو کے لوٹ آئے
لوگ احساس کمتری میں رہے

ہر اک تمہارے تبسم کے پھول چنتا ہے
جسے بھی دیکھتے ہو مسکرانے لگتے ہو

سر جھکائے ہوئے پھرتے ہیں سبھی سر والے
دار خالی ہے سر دار نہیں ہے کوئی

کہاں کیا کیا ہوا، سب بھول جاؤ
یہ باتیں نازنینیں سوچتی ہیں

کچھ تو وہ بھول بیٹھے تھے اداب انجمن
کچھ ہم بھی جان بوجھ کے دیوانے بن گئے

بس ایک قرض رہ گیا ہے دل میں اس کی یاد کا
ہمارا بزم ناز سے حساب کردیا گیا

یہ شاعری اس لکھنؤ کی شاعری ہے جس نے کبھی تغزل کی محفلیں سجائی تھیں اوران محفلوں میں شعراء کی ناز برداریاں کی تھیں اوران ناز برداریوں میں زبان وبیان کے گل بوٹے سجائے تھے اوران گل بوٹوں کوافکار کی خوشبو سے معطر کیا تھااور پھر خوشبو سے دراززلفوں اورنازک ہونٹوں کی آبیاری کی تھی اور نتیجے میں مثنوی اور غزل کی رگوں میں لہو دوڑرہاہے اور جسے تسنیم فاروقی کے کلام میں بھی دیکھاجاسکتاہے۔

تسنیم فاروقی کی زبان لکھنؤ اسکول کی صاف وشفاف زبان ہے۔ اس زبان میں نہ تو کھردراپن ہے نہ ایسے کھانچے اور موڑ ہیں کہ ذہن کو تھکادیں،

عقل کو لرزہ دیں اور دل کو دہلادیں۔ یہ زبان مرثیوں' امام باڑوں' مجلسوں رؤسا کی گفتگو اور شرفاء کی محفلوں کی وہ زبان ہے جس پر ریشم اور ململ کے باریک دھاگوں سے کشیدہ کاری کی گئی ہے اور یہ شرف آج بھی اہل لکھنؤ کو ہی حاصل ہے کہ ان کا فرمایا ہوا ہی مستند ہے۔ یہی سبب ہے کہ میں تسنیم فاروقی کو موجودہ لکھنؤ کا سب سے اہم اور نمائندہ شاعر تسلیم کرتا ہوں۔

خیام-حکمت و فلسفہ کا خیمہ دوز

عمر خیام مشرق کا شاعر، فلسفی، حکیم اور عالم بیدل گذرا ہے۔ مگر ہماری ادبی دنیا میں وہ مغرب کی راہ سے داخل ہوا ہے اور اس کی بے شمار رباعیات میں مغربی ممالک کے لئے بڑی جاذبیت ہے جس کے نتیجہ میں عمر خیام کی رباعیات کے ایک سو سے زائد نسخے مختلف طریقوں سے شائع ہو چکے ہیں۔ ادھر پچاس برس کی مدت میں مغربی سے آیا ہوا مشرقی خیام؛ مشرق کی توجہ کا مرکز بنا اور اس کے فن و کمال کی طرف توجہ دی گئی۔ جس کے نتیجہ میں خیام بھی ہماری توجہ اور فکر کے آغوش میں پرورش پا کر ایک نئے انداز سے جوان اور توانا ہو کر دوڑنے لگا۔ اٹھ سو برس کے بعد بھی اگر اپنا گوہر گم شدہ مل جائے تو کوئی نقصان یا خسارہ کی بات نہیں ہے۔

عمر خیام پانچویں صدی ہجری مین تولد ہوئے۔ نام عمر، لقب غیاث الدین ابوالفتح کنیت اور تخلص خیام تھا۔ اور والد کا نام عثانی تھا۔ آبائی پیشہ جامہ بافی

تھا، لیکن عثمان نے اس پیشہ کو چھوڑ کر خیمہ دوزی اختیار کر لی تھی۔ لیکن خیام نے اس پیشہ کو کبھی اختیار نہ کیا بلکہ حکمت و فلسفہ کی خیمہ دوزی کرتے رہے۔

خیام کہ خیمہ ہائے حکمت می دوخت
دو کورۂ غم فتادہ نماگاہ بسوخت
مقراض اجل طناب عمرش چو برید
دلال قضا برائگانش بفروخت

ترجمہ:۔ خیام نے حکمت کے جو خیمے سیے۔ غم کے اندھیرے میں یکبارگی وہ جل گئے۔ موت کی قینچی نے عمر کی رسی کو جب کاٹا تو ملک الموت نے مفت میں بیچ ڈالا۔

عمر خیام کی زندگی مسلسل رنج و غم اور درد و کرب کے سیلاب سے ہو کر گزرتی رہی۔ زمانے کے ہاتھوں ان کی ناقدری ہوئی۔ ان کی حکمت و دانائی کی ان کو سزا ملی۔ زمانے کے ساتھ وہ رازدان فطرت نہ چل سکا اس نے وقت اور زمانے کے انداز فکر کے خلاف اپنی نئی راہ بنائی اور اپنی فکر و فن اور علم و دانش کی بنیاد پر جو کاخ بلند تیار کیا وقت کی بونی عقلیں وہاں تک نہ پہونچ سکیں جس کے نتیجہ میں اس کی تمام دانائی، علم و حکمت اور معرفت اس کے سینہ ہی میں تڑپتی رہی اور جب کبھی شاگردوں کے پیہم اصرار پر اس کو ظاہر کیا تو جاہلوں نے غوغا اور شور و غل سے آسماں سر پر اٹھالیا۔

نیشاپور خراسان کا مردم خیز خطہ ہے جہاں سے شیخ فرید الدین عطار جیسی شخصیت پیدا ہوئی۔ اس کا مدرسۃ العلوم ان دنوں سارے زمانے مین شہرت کا مالک تھا۔ امام موفق کے شیخ الاساتذہ ہونے کی وجہ سے اس کی اور زیادہ دھوم مچی ہوئی تھی امام موصوف اپنے وقت کے عالم بیدل، ظاہر و باطن میں انتہائی عظیم

الرفعت و مقتدائے اہل سنت والجماعت تھے۔ موصوف کے متعلق یہ روایت مشہور تھی کہ آپ کے حلقۂ درس سے نکلنے والا اپنے ساتھ دولت واقبال لیکر نکلتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ نظام الملک کے والد نے طوس سے حسن بن علی کو موصوف کی خدمت میں روانہ کیا اور یہیں، حسن بن صباح، خیام اور نظام الملک کی دوستی ہوئی۔ چونکہ تینوں ذکی الفہم، خوش اخلاق و تیز طبع تھے۔ اس لئے باہم رشتۂ یگانگت والفت میں جڑ گئے۔ اور یہیں تینوں میں یہ بات طے ہوئی کہ ہم میں سے جو کوئی اعلیٰ مرتبہ پر پہونچے وہ اپنے ساتھیوں کو یاد رکھے اور ان کی مدد کرے۔

تعلیم سے فارغ ہو کر تینوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ حسن ابن علی (نظام الملک) خراسان، غزنیں، کابل، اور ماوراء النہر کی سیاحت کے بعد اصفہان پہونچا جو سلطان الپ ارسلان سلجوقی کا پایہ تخت تھا۔ حسن ابن علی اپنی تدابیر ولیاقت سے دبیر الملک (وزیر اعظم) اور نظام الملک کے لقب سے سرفراز ہوئے۔

خیام کو اپنے دیرینہ دوست اور ہم مکتب کی عہدہ و منصب کا علم ہوا تو اصفہان پہونچے۔ نظام الملک اخلاق و مہربانی سے پیش آیا اور اپنے عہد کو پورا کرنے کے لئے کہا کہ الپ ارسلان کے سامنے خیام کے اوصاف اور محاسن بیان کر کے کسی اعلیٰ عہدہ پر فائز کرا دیں مگر خیام جو علم و حکمت کی مسند پر جلوہ فگن تھا اس کے لئے الپ ارسلان کی حکومت میں کوئی عہدہ لینا باعث ننگ و عار تھا۔ وہ خود اقلیم قناعت کا شہنشاہ تھا۔ اس لئے اسے نہ تو کسی درباری خطاب کی خواہش و طلب تھی اور نہ سرکاری عہدہ کی طمع۔ خیام نے اپنے دوست کا شکریہ

ادا کیا۔ خیام کے نزدیک قابل رشک اور شرافت کی زندگی کا مطلب تھا۔

درد هرهر آنکه نیم نانی دارد
وزیر نشست آستانی دارد
نی خادم کس بودنه مخدوم کسی
گوشاد بزی که خوش جهانے دارد

❖❖❖❖

درراه چنان روکه سلامت نکنند
باخلق چنان زی که قیامت نکنند
درمسجد اگرروی چنان روکه ترا
درپیش نه خوانند وامامت نکنند

لیکن نظام الملک کے پیہم اصرار پر ان کی دلداری کے لئے کہا کہ آپ مجھ کو فکر معاش سے بے نیاز کر دیں تاکہ میں علمی وادبی خدمات انجام دے سکوں۔ نظام الملک نے جب سمجھ لیا کہ خیام کو دنیاوی جاہ وعزت کی خواہش نہیں اور وہ سر تاپا علم و حکمت اور معرفت الٰہی میں غرق ہے تو اس کے لئے ۱۲۰۰ سو مثقال طلائی مقرر کر دیئے۔ وہاں سے واپس ہو کر خیام نے علوم وفنون کی تحقیق میں اپنے کو گم کر دیا اور فن ہیئت میں وہ کمال حاصل کیا کہ دنیا دنگ رہ گئی۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خیام کی عزت واحترام میں اضافہ ہوتا ہی گیا اور ہر شخص ان کا قرب حاصل کرنا اپنے لئے موجب فخر و مباہات سمجھنے لگا۔ نظام الملک کی ایک پیش کش کو ٹھکرا کر انہوں نے وہ مرتبہ پایا کہ وقت کے حکمراں ان کے سامنے جھک گئے۔ ملک شاہ سلجوقی شہنشاہ اعظم خیام سے دوستانہ تعلقات رکھتا تھا سلطان سنجر تخت پر اپنے پہلو میں بٹھاتا تھا۔

خیام کو ہر معاملہ میں عوام پر فوقیت حاصل تھی چنانچہ موت بھی ایک مخصوص انداز اور شان سے آئی۔ایک روز شیخ الرئیس کی کتاب شفا دیکھ رہے تھے۔جب وحدت و کثرت کی بحث پر پہونچے تو کتاب میں خلال رکھ کر بند کر دی اور نماز پڑھی وفات کی شام تک کچھ کھایا نہیں یہاں تک عشاء کا وقت ہو گیا عشاء کی نماز سے فارغ ہوئے سجدہ میں سر رکھ کر کہا خداوند تیری معرفت جس حد تک میرے امکان میں تھی میں نے اس میں مطلق کوتاہی نہیں کی۔اس لئے اب مجھے بخش دے۔"

یہی دعا زبان پر تھی کہ روح جسم سے پرواز کر گئی۔"

فقہ، قرأت، ادب، تفسیر، تاریخ، فلسفہ، ہیئت، اور نجوم میں مقتدائے زمان اور امام وقت تھے۔ غیاث الدین کا لقب اس بات کا ثبوت ہے۔

ایک مرتبہ وزیر عبدالرزاق کے ہاں علمی بحث چل رہی تھی غزالی جو فن قرأت کے امام تھے وہاں موجود تھے۔خیام بھی اسی بیچ میں آگئے۔عبدالرزاق کو دیکھ کر بول اٹھے۔واقف کار آگیا اور اسی کے ہاتھ فیصلہ ہے۔"

امر مابہ النزاع خیام کے سامنے پیش کیا گیا۔ خیام نے سارے معاملہ کو سن کر تقریر شروع کی اور تفصیل سے ان کے وجوہ و دلائل پر گفتگو کرتے ہوئے اس طرح فیصلہ سنایا کہ آگے بحث کی گنجائش نہ رہی۔ علامہ غزالی نے کہا کہ حکماؑ کس شمار میں ہیں خود قراؑ کو بھی یہ معلومات حاصل نہیں ہو سکتیں!!

خیام عجیب ذہن و دماغ لیکر پیدا ہوائے تھے ان کی قوت حافظہ اور ذہنی لیاقت کا کوئی جواب نہ تھا۔ایک مرتبہ اصفہان مین ایک کتاب نظر سے گزری کتاب نایاب تھی سات بار پے در پے مطالعہ کیا اور نیشاپور آکر پوری کتاب لکھادی اصل سے مقابلہ پر معمولی سا فرق نکلا"۔

علم نجوم میں بھی بہت زیادہ مہارت تھی۔ سنہ جلالی اور تقویم اس کی حسن لیاقت کی بیّن دلیل ہے۔ اس میں تمام نقشے دئے گئے ہیں اور اسکا نام "زیچ ملک شاہی" ہے۔

خیام علم و حکمت کے جس تخت پر متمکن تھے رعیت نے ان کی علمی لیاقت قابلیت، عقل و دانش سے اپنے مزاج نفس و خواہش کی تسکین کے لئے صرف وقتی فائدہ اٹھانے میں کوئی کمی نہ اٹھا رکھی لیکن جس عظیم مرتبہ اور عظمت کے وہ مستحق تھے وہ انھیں نہ مل سکی۔

دوسرے صدی ہجری سے ہی اسلام جو ایک عظیم الشان یونیورسٹی، دانش گاہ کی حیثیت رکھتا تھا مکتبوں میں تقسیم ہو گیا۔ ہر مکتب کا ایک مدرس تھا اور وہی اپنے کو عقل کل اور نجات کا مستحق خیال کرتا تھا۔ شیعہ، سنی، معتزلہ، و اشاعرہ، اسلامی دانشگاہ سے الگ ہو کر مختلف مکاتب میں تقسیم ہو کر مدرس ہوتے ہوئے بھی امام وقت بنے رہے۔ اور ایک دوسرے کو کافر، بے دین، ملعون اور جہنمی بتاتے رہے۔ گویا اسلام کے نام پر انہوں نے امامت حاصل کی لیکن اسلام کو چھوڑ کر اس کی رسی کو توڑ کر، یہ نعرہ بازی زبانی ہی نہیں رہی بلکہ تلوار نے بھی اپنی کاٹ دکھائی اور ہزاروں گردنیں اس فتنہ و فساد کی نذر ہو گئیں۔ قرآن کو قدیم کہنے اور اللہ کو عرش الٰہی پر متمکن تسلیم کرنے پر نہ جانے کتنے لوگ قتل ہو گئے۔ غرض نفرت، بغض و عداوت جہالت اور بدعت کا وہ طوفان اٹھا کہ اسلام کو مضحکہ بنا کر دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ ان ہی عینکوں سے ہر شخص کو دیکھا جاتا تھا۔ لیکن جو اسلام کی حکیمانہ تعلیم اور اس کی دعوت عظیم کا پیکر تھے، جو علم و حکمت کے درخشندہ ستارے تھے، جو منارۂ علم تھے وہ ان تاریکیوں میں کیونکر بھٹک سکتے تھے۔ مولویانہ ذہن کی تباہ کاریاں خیام کے سامنے تھیں ان کو وہ گلے

کا ہار نہیں بنا سکتے تھے ۔ انہوں نے اسلام کی عالگیر دعوت اور رموز کائنات کو کھولنے میں اپنی زندگی صرف کردی۔ انہوں نے علم وحکمت اور وسیع کائنات کی بناوٹ اور ترتیب کا غایر مطالعہ کر کے اللہ کی ذات اور اسکی حکمت ودانائی کو سمجھنے میں اپنی زندگی صرف کردی، اور مرتے وقت اسی ذات کا نام ورد زبان رہا۔ اس کی حکمت ودانائی کا چرچا کیا۔ اس عہد کے لوگوں نے خیام کو معاف نہیں کیا لیکن خیام کے نزدیک کمال انسانیت کائنات کے مطالعہ کے سوا کچھ نہ تھا۔

اسرار حقیقت نشود حل بسوال
نہ نیز بدر باختن نعمت ومال
تاجاں نکنی خوں نہ خوری پنجہ سال
از قال ترارہ نہ نمایند بحال

ہر چیز میں خیام کو قادر مطلق کی صنعت ودستکاری اور کرشمے دکھائی دیتے تھے۔ اور ہر شے میں اس کی جلوہ گری خیال کرتے تھے۔

گہہ گشتہ نہاں روے بکس تنمائی
گہ درصور کون ومکاں پیدائی
دیں جلوہ گری بخویشتن بنمائی
خود عیں عیانی وخودی بینائی

اس عہد میں مولویوں کا کہنا تھا کہ ہر شخص کو دین کے مطالعہ میں بولنے کا حق نہیں ہے لیکن خیام اس کے مخالف تھے ان کا کہنا تھا کہ عقل خدا کا عطیہ ہے۔ اور اس سے کام لینے کا سب کو پورا پورا حق حاصل ہے۔

آنہاں کہ جہاں زیر قدم فرسودند
واندر طلبش ہر دو جہاں پیمودند

آگاہ نمی شوم کہ ایشان شب و روز
زیں حال چنانکہ ہست آگاہ بودند

خیام کے خیال میں حد سے تجاوز کرنا زیادتی ہے۔ لیکن رموز شریعت میں لب کشائی پر حدیں لگانا بھی تفریط سے کم نہیں۔ خیام اپنے ان ہی خیالات کی وجہ سے علم و حکمت کا تاجدار ہوتے ہوئے بھی عوام کی نظروں میں بد ظنی کا شکار ہو کر رہا ہے اور لوگوں میں ان خیالات کے خلاف برہمی پیدا کرائی گئی اور ایک جماعت خیام کے قتل پر تیار ہو گئی۔ تو انہوں نے خیال ظاہر کیا۔

با درد بساز تادوائے یابے
از درد منال تاشفائے یابے
می باش بوقت بینوائی شاکر
تاعاقبت الامر نوائے یابے

اس کے بعد وہ حج کرنے چلے گئے وہاں سے واپسی پر جب بغداد پہونچے تو علم و فلسفہ کے شائقین ان کے گرد جمع ہو گئے۔ لیکن انہوں نے طے کر لیا تھا کہ وہ ایسے خیالات کا اظہار کر کے جن سے عوامی جذبات میں ہیجان پیدا ہو مزید عوامی مخالفت لینا دانائی و عقلمندی نہیں ہے۔ لہذا انہوں نے خاموشی اختیار کر لی اور گوشہ عافیت میں بیٹھکر فطرت کے راز ہائے سربستہ سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ لیکن کرب و بے چینی کے عالم میں پکار اٹھے۔

اسرار جہاں چنانکہ در دفتر ماست
گفتن نتواں زانکہ وبال سر ماست
چوں نیست دریں مردم دنیا اہلی
گفتن نتواں ہرانچہ در خاطر ماست

غرض یہ کہ خیام کے اندر جاہلوں کے خلاف شاید قسم کا طوفان برپا تھا۔

لیکن جاہلوں سے بحث ومباحثہ میں پڑ کر اپنا وقت برباد کرنا نہیں چاہتے تھے۔ جو لوگ علم ودانش کے پیکر اور فن مناظرہ کے ماہر ہوتے ہیں اور کلی طور پر اس میں دسترس رکھتے ہیں کبھی بھی آسانی سے کسی مسئلہ پر بحث کے لئے تیار نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے خیام نے بھی خاموشی اختیار کر لی لیکن اندر ہی اندر ایک آتش فشاں سلگتا رہا۔ ان خیالات کا اثر ان کی شاعری پر ہو کر رہا۔ چنانچہ فارسی کا کوئی شاعر ان کے الفاظ کی تیزی فکر کی پختگی اور بھرپور انداز بیان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ خیام کے سامنے جس طرح کے خیالات آئے انہوں نے ان کو شعری جامہ عطا کر دیا۔ جذبات واحساسات کو ایک تاثر کے ساتھ موزوں الفاظ میں ادا کر دینا ہی شاعری ہے۔ خیام کی رباعیات میں یہی بنیادی شاعرانہ عنصر غالب ہے جو ان کو تمام فارسی شاعروں سے ممتاز کرتا ہے۔ ہر بار ایک ہی خیال کو نئے انداز سے پیدا کرنے میں خیام کو اولیت حاصل ہے۔ طویل خیالات کو مختصر انداز سے بیان کرنے کے لئے صنف شاعری میں رباعی کے سوا دوسری کوئی شکل ممکن نہ تھی اس لئے انہوں نے رباعی کو اپنے حکیمانہ اظہار خیال کا موضوع بنایا۔ ان کی رباعیات صرف علم وحکمت کی خشک واعظانہ نصیحت کی حامل نہیں۔ بلکہ ان میں ایک خاص قسم کی شوخی ومتانت ولطافت ومزاح کی آمیزش بھی ہے۔ کیسے لطیف، دلکش، اور دلفریب انداز سے کہتے ہیں۔

من مے فورم ومخالفاں از چپ و راست
گویند مخور با دہ کہ دین دا عداست
چوں دانستم کہ مے عدوے دین است
واللہ بخورم خون عدو راکہ رواست
دیگر غم این گردش گردوں نخوریم

جذبادۂ صاف دمئے گلگوں نخوریم
مے خونِ جہاں است وجہاں خونی ما
ماخونِ دل خونی خودچوں نخوریم

❖❖❖❖

امروز کہ نوبت جوانی من است
مے نوشم زانکہ زندگانی من است
عیبش میکندزانکہ تلخ است، خوش است
تلخ است ازانکہ زنگانی من است

❖❖❖❖

آباد خربات زمے خوردں ما است
خونِ دوہزار توبہ درگردن ماپست
گرمن نکنم گناہ رحمت چہ کند
آرایش رحمت از گنہ کردنِ ماست

❖❖❖❖

خیام زبہر گنہ ایں ماتم چیست
درخوردن غم فائدہ بیش وکم چیست
آن راکہ گنہ نکرد غفراں بنود
غفراں زبرائے گنہ آمد غم چیست

❖❖❖❖

مندرجہ بالا رباعیات میں شراب ہی کے متعلق مختلف ڈھنگ سے
کہا گیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ شراب جائز ہے اس کے لئے

مختلف تاویلات اور دلائل تلاش کئے گئے ہیں۔ اور خیال کو نازک ،دلنشیں اور پر اثر بنایا گیا ہے۔

کہیں تو کہا کہ شراب دشمن دین ہے، اسی لئے پیتا ہوں کہ دشمن کا خون پینا روا ہے۔

اور کہیں شراب کو دشمنِ زمانہ کا خون کہہ کر جائز کر لیا ہے۔

اور کہیں کہا ہے کہ شراب تلخ ہے تو زندگی کی تلخیاں برداشت کرنا ہی فتح مندی کی دلیل ہے۔

اور کہیں کہا ہے کہ شراب پینا گناہ ہے اور رحمت کی ساری آرائش میرے گناہ کرنے سے ہی ہے اگر گناہ نہ کروں تو رحمت بے معنی شے بن کر رہ جائے گی۔

اور پھر کہا ہے کہ رحمت انھیں کے لئے ہے جو گناہ گار ہیں۔

یہ اور اسی طرح کے خیالات سے خیام کی رباعیات بھری پڑی ہیں اس مختصر سے مضمون میں ان کے لئے جگہ نہیں ہے۔

خیام کا عہد اور زمانہ نئے نئے خیالات کا زمانہ تھا۔ یونانی فلسفہ اور یہودی موشگافیاں مسلمانوں میں جگہ بنا چکی تھیں اسلام کی فکر پر بھرپور وار کیا جا چکا تھا۔ خیام ایک شاعر اور حساس دل رکھتا تھا اس کے سامنے یہ فلسفیانہ بحثیں اور موشگافیاں تھیں ہو سکتا ہے کہ خیام کے سامنے ایسے لوگ رہے ہوں جن کو شراب پینے سے روکا گیا ہو، جس کو بتایا گیا ہو کہ یہ راہ اچھی نہیں ہے اور شراب دشمن دین وایمان ہے اور انہوں نے جواب دیا ہو تب تو دشمن کا خون پینا روا ہے، جائز ہے۔ اور اس کی فکر وخیال کو خیام نے نظم کر دیا ہو۔

اس لئے کہ خیام جو ایک مفسر تھا، فقیہہ تھا، فن قرأت کا ماہر تھا۔ رموز

قرآن سے واقف تھا کیونکر شراب سے اپنے دامن کو آلودہ کر سکتا تھا۔ اس کی شراب کی بنیاد اگر یہی رباعیات ہیں اور انھیں کی بنیاد پر اس کو شرابی قرار دیا گیا ہے۔ تو پھر اسی کے رباعی اس الزام کو باطل بھی کر دے گی۔

فاسق خوانند مرد مانم پیوست
من بیگنہم خیال شان بیں کہ چہ ہست
برمن خلافِ شرع اے اہل صلاح
جز خمر ولواطت وزنا چیزی ہست

اگر پہلی رباعیاں ان کو شرابی ظاہر کرتی ہیں جن میں قطعی طور پر اس امر کا اشارہ بھی نہیں ملتا تو یہ رباعی پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ مجھ میں شراب خوری، اور زنا کے علاوہ کچھ برائیاں ضرور ہیں لیکن ان میں سے کوئی ایک برائی بھی مجھ میں نہیں ہے۔

اسلامی معاشرہ میں اس طرح کے خیالات پرورش دینے والے یقیناً علماء جاہ پرست تھے۔ جنہوں نے اسلام اور تعلیمات اسلام کو اپنے دل ودماغ پر طاری کرنے کے بجائے اسلام کی جھول اپنے اوپر ڈال لی تھی اور جن کی زندگی کا مقصد محض بناوٹ، تصنع اور مکرو ریا کے سوا کچھ نہ تھا۔ اسی بناوٹ اور مکرو ریا کو دیکھ کر کسی من چلے فلسفی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہو گا۔ جس کو خیام نے رموز الفاظ میں دلچسپ اور اثر انداز بنا دیا۔

من بادہ خورم ولیک مستی نکنم
الا بقدح دراز دستی نکم
دانی غرضم زمے پرستی چہ بود
تا ہمچو تو خویشتن پرستی نکم

دوسری جگہ اسی خیال کو کہ میرا شراب پینا اسی سبب ہے کہ کہیں میں بھی خودپرستی اور دوسروں پر دست درازی نہ کرنے لگوں۔

اے مفتی شہر از تو پرکار تریم
باایں ہمہ مستی از تو ہشیار تریم
تو خون کسان خوری و ماخوں رزاں
انصاف بدہ کدام خونخوار تریم

انسانی زندگی کی ساری اساس اخلاق اور انسانوں سے باہمی ربط اور ان سے اخلاق و محبت اختیار کرنے ہی پر قائم ہے۔انسانی معاشرہ میں تمام برائیاں غیبت و بدگوئی، تصنع اور بناوٹ، دل آزاری، ایذارسانی ، حب جاہ اور طمع و بدگوئی اور دوسروں کے راز کو ظاہر کرنا ہی سماجی برائیوں کو جنم دیتے ہیں۔ اور شرافت کو بٹہ لگاتے ہیں لیکن صبر و قناعت، احسان اور شکریہ تمام چیزیں انسانیت کی محافظ اور قدر و عزت کو بڑھانے والی ہیں۔ اس سلسلہ میں خیام کی بے شمار رباعیات ہیں یہاں بھی اپنے فن و فکر ،لطافت و سادگی ، چستی ،اور بلندیٔ افکار کو قائم رکھاہے۔ اور نصیحت کے پردے میں تیز تیکھے نشتر بھی لگائے ہیں تاکہ انسانی ذہنوں کا فاسد مادہ خارج ہو جائے اور صالح سماج وجود میں آسکے۔

اے نیک نکردۂ بدیہا کردہ
آنگاہ بلطف حق تولا کردہ
بر عفو مکن تکیہ کہ ہرگز بنود
ناکردہ چو کردہ کردہ چوں ناکردہ

❖❖❖❖❖

زاں پیش کہ از جام اجل مست شوی

زیر نکند حادثہ ہاپست شوی
سرمایہ بدست آردریں رہ کیں جا
سودے نکنی اگر تہی دست شوی

❖❖❖❖

بادشمن ودوست قول نیکو نیکوست
بد کے کند آنکہ نیکیش عادت اوست
بادوست چوبدکنی شوی دشمن تو
بادشمن اگر نیک کنی گردد دوست

❖❖❖❖

بدخواہ کساں ہیچ بمقصد نرسد
یک بدنکند تابخودش صدنرسد
من نیک تو خواہم وتوخودہی بدمن
تونیک نہ بنی وبمن بدنرسد

❖❖❖❖

عمر خیام کی تعلیم خالص مذہبی ماحول میں ہوئی تھی۔انہوں نے قرآن حدیث اور عربی ادب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ قرآن اور قرأت پر ان کو مکمل عبور تھا جس کا ثبوت رئیس القراء عبدالرزاق اور امام غزالی سے ایک آیت کی قرأت کے اختلاف کے سلسلہ میں دئے گئے طویل جواب سے ملتا ہے۔
ہوسکتا ہے کہ یونانی فلسفہ، علم نجوم اور علم ہیئت نے ان کے دماغ میں کچھ شکوک پیدا کئے ہوں یادین اسلام کی حقانیت اور اس کے دین فطرت ہونے میں اور زیادہ یقین واستحکام پیدا کردیا ہو لیکن رسم وروایات میں کھوئی ہوئی امت کے خیالات

وافکار کو ماننے سے انکار کر کے عوامی جہل کا نشانہ بن گئے ہوں ہم خیام کی ایک شاعر کی حیثیت سے قدر کرتے ہیں اس لئے کہ ہمارے سامنے اس کے اشعار، ان کی ادا، تیزی تیکھاپن، بندش، چستی، دوراز کا تشبیہات واستعارات اور بلندئی افکار کے ساتھ اعلیٰ اور معیاری زبان کا استعمال ہی رہا ہے۔ اور ہم اس پیمانے سے کسی شاعر کے کلام کو ناپتے ہیں کہ اس کے الفاظ طرز ادا، اور انداز بیان نے ہمارے ذہن پر کتنا اثر چھوڑا اور ہمارے ذہن پر اس کے اشعار، خیال اور فکر کا کیا تاثر قائم ہوا اور وہ اپنے خیال کو ادا کرنے میں کہاں تک کامیاب رہا۔